اقبال

بخیال

منتخب مضامین

ب • پروفیسر بشیر احمد نحوی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

۱

اقبالؔ ۔ بحرِ خیال

(فکرِ اقبال پر گلدستۂ مضامین)

مرتّب

پروفیسر بشیر احمد نحوی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر

جملہ حقوق بحق اقبال انسٹی ٹیوٹ محفوظ ہیں۔

نام کتاب	:	اقبالؔ ۔ بحرِ خیال (فکر اقبال پر گلدستۂ مضامین)
مرتّب	:	پروفیسر بشیر احمد نحویؔ
سالِ اشاعت	:	فروری ۲۰۰۷ء
قیمت	:	۳۰۰ روپے (Rs. 300/-)
کمپوزنگ	:	وین گارڈ سرینگر۔ ۹۹۰۶۴۹۲۴۲۷
مطبع	:	مخدومی پرنٹرس، سرینگر۔

ملنے کا پتہ:

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

فہرست مضامین

۱	گفتنی	پروفیسر بشیر احمد نحوی	۵
۲	اقبال کا فن ۔۔۔ ایک عمومی جایزہ	پروفیسر آل احمد سرور	۷
۳	شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت	پروفیسر عبدالمغنی	۲۷
۴	اسماالرجال، اقبال	ڈاکٹر محمد دین تاثیر	۴۹
۵	علاّمہ اقبال ۔۔۔۔ اجتہاد اور ختمِ نبوت	پروفیسر محمد منور	۶۳
۶	اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے	ممنون حسن خاں	۷۳
۷	اقبال اور فیض	شفیق اشرفی	۸۳
۸	یونیورسٹیوں میں مطالعہ اقبال کے دس سال	ڈاکٹر سید معین الرحمان	۹۵
۹	روایت، اقبال اور شریعتی	ڈاکٹر علی محمد صدیق	۱۱۹
۱۰	علاّمہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری	ڈاکٹر محمد شفیع	۱۲۹
۱۱	شعری باقیات کی تدوین نو (جواز، مسائل اور طریقہ کار)	ڈاکٹر صابر کلوروی	۱۵۷
۱۲	اقبال شناسی میں بھوپال کا حصّہ	سائمہ رفعت	۱۹۷
۱۳	فکر اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع	چودھری مظفر حسین	۲۰۷
۱۴	اقبال دشمنی یا دریدہ دہنی ۔ ایک تجزیہ	پروفیسر بشیر احمد نحوی	۲۳۱

پروفیسر بشیر احمد نحوی

گفتنی

''اقبال۔ بحرِ خیال'' انتخابِ مضامین کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے جس کے تحت ہم ہندو پاک میں علامہ اقبال کے تصورات و تخیلات پر نایاب، نادر اور عمدہ ترین مضامین و مقالات کو عوام الناس تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتخابِ مضامین ان کتابوں سے لیا گیا ہے، جو یا تو بازار سے اب غائب ہیں، یا چند کتب خانوں کے ریفرنس سیکشنوں تک محدود ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ سے پہلے ''نفحات اقبال'' اور ''اقبال کی تجلیات'' دو ایسے مجموعے ہیں، جن کی اشاعت پر انسٹی ٹیوٹ کو ملک کے کونے کونے سے توصیفی خطوط موصول ہوئے۔ یہ مضامین اگرچہ تحریری طور تکرار کے زمرے میں آتے ہیں، لیکن ادب کے میدان میں کسی عمدہ شعر کو، کسی سنجیدہ مقولے کو اور کسی بیش بہا اقتباس کو بار بار پڑھنا، چھاپنا، عام کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ ان مضامین کو دوبارہ پڑھنے سے فکر کی نئی

راہیں کھُل سکتی ہیں۔ سوچ کے زاویئے بدل سکتے ہیں اور پھر جب معاملہ علامہ اقبالؔ کی کثیر الابعاد ذات کا ہو، تو تکرار میں خوبی اور رعنائی کا دنیا انداز جلوہ افگن، ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے میں پروفیسر سرور کی ناقدانہ نظر سے لیکر صائمہ رفعت کے مضمون ''بھوپال میں اقبالؔ'' تک چند نئی باتوں سے قارئین کتاب کی واقفیت میں اضافہ کا باعث ہو جائے گی۔ توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعہ کو قبولیت حاصل ہوگی۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ

اقبالؔ کا فن ۔۔۔ ایک عمومی جائزہ

نارتھ روپ فرائی نے کہا ہے کہ شاعر اپنے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ خاصی دلچسپی رکھتا ہے مگر لازمی طور پر کوئی خاص استناد نہیں رکھتا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اقبالؔ نے اپنے یا اپنے فن کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں انہیں ملحوظ تو رکھنا چاہئے مگر اُن پر تکیہ نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً وہ رنگ و آب شاعری سے خاصے بیزار ہیں اور تہمت شعر و سخن تک گوارا نہیں کرتے مگر ساری عمر شاعری کرتے رہے اور یہی رنگ و آب شاعری ان کی عظمت کا ضامن ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ ان کی شاعری مقصدی ہے، وہ ناقۂ بے زمام کو قطار میں لانا چاہتے ہیں، اپنا نورِ بصیرت عام کرنا چاہتے ہیں اور انسان کو تخلیق میں خدا کا ہمسفر بنانا چاہتے ہیں، لیکن اُن کے مقصد کی بلندی کا اعتراف کرتے ہوئے ہمارے نزدیک اس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ شاعری بن کر آتا ہے، وہ برہنہ حرف نگفتن کو کمال گویائی سمجھتے ہیں مگر ان کے نزدیک برہنہ اسلوب کی کاٹ بھی مسلّم ہے۔ وہ رجائیت اور امید آفرینی کو

ضروری سمجھتے ہیں اور اس شاعری کی مذمت کرتے ہیں جو روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرے یا موت کی نقش گری کرے وہ یقین کی دولت کو عام کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کے یہاں تشکیک بھی ملتی ہے، تنہائی کا احساس بھی اور ایک ہلکی سی حزنیہ لے بھی، انہوں نے بار بار کہا ہے کہ وہ زبان کو ایک بُت نہیں سمجھتے اور نہ زبان سے باخبر ہیں۔ اُن کے پاس اس کی باریکیوں پر توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں مگر زبان کے رموز، فن کے دروبست اور آدابِ سخن سے واقف ہیں۔ باقیات اقبالؔ کے تیسرے ایڈیشن میں جو سرمایہ ملتا ہے اس کا نصف سے کم حصّہ ہی بانگِ درا میں آسکا ہے۔ حال میں بالِ جبریل کا متروک کلام بھی سامنے آیا ہے جس سے ساقی نامہ، زمانہ اور ذوق وشوق جیسی معرکتہ الآرا نظموں کے نقشِ اول کا علم ہوتا ہے۔ وہ گرامی کی شاعری کے قایل تھے۔ مگر ان کی مروجہ اصلاحوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکے۔ اس لئے اقبالؔ کے فن کے مطالعہ میں ہمیں شاعر کے ان خیالات کو جو نظم کے اشاروں میں اور نثری بیانات میں ملتے ہیں ذہن میں رکھنا تو چاہئے کیوں کہ ان سے ''چاہیے'' کی نشاندہی ہوتی ہے مگر توجہ دراصل ان کے ''ہے'' یعنی شعری کارنامے پر ہی مرکوز ہونی چاہئے۔ بقول ڈی۔ ایچ۔ لارنس ''داستان کی بات مانو داستان گو کی نہیں۔''

''شاعری بہر حال شاعر سے زیادہ سچی ہوتی ہے'' اقبالؔ کی شاعری کی سچائی کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس ادبی پس منظر کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ جس میں

اقبالؔ نے شاعری شروع کی، پھر ان اثرات کو جن کے زیرِ اثر ان کی شاعری کا ارتقا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کی شخصیت اور اس پر اہم ذاتی اور سماجی اثرات کو، یہاں بات فکری میلانات کی صرف اس حد تک ہوگی جس حد تک وہ فن کے نگار خانے کو رنگ و آہنگ دیتے اور اسے کئی ابعاد عطا کرتے ہیں۔ دراصل گفتگو فن کے اسرار و رموز پر ہوگی۔ اقبالؔ کی نوعمری میں داغؔ و امیرؔ کی زبان کے ساتھ غالبؔ کی تازہ کاری اور سرسیّد کی تحریک کے اثر سے ایک پیامی اور اصلاحی لے کی غزل کے ساتھ ساتھ نظموں پر توجہ بھی شروع ہو چکی تھی۔ موضوعات کے انتخاب میں گرد و پیش کے حقائق اور شعری زبان میں قدرے لچک کا احساس ملنے لگا تھا۔ اقبالؔ کی مادری زبان پنجابی تھی۔ انہوں نے عربی زبان کے ساتھ فارسی بھی بڑی محنت سے سیکھی اور اساتذہ کے کلام پر گہری نظر ڈالی۔ ان کی ابتدائی کاوشوں میں نالۂ یتیم اور ایک یتیم کا خواب ہلالِ عید سے قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں طویل نظمیں بانگِ درا میں شامل نہیں اور ابتدائی طویل نظموں میں سے فریادِ اُمّت کا صرف ایک بند دل کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل کیا گیا۔ بانگِ درا کا آغاز ہمالہ سے ہوتا ہے۔ مگر ان تینوں نظموں میں 'نالۂ یتیم' ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' اور ہمالہ میں حالیؔ کے پیامی اور خطابیہ لے کے ساتھ غالبؔ کے فکر و فن کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ یعنی شروع سے اقبالؔ کا اسلوب غالبؔ کی خلاقی، ان کی فکر کی بلندی اور ان کے استعاراتی نظام کی یاد دلاتا ہے۔ والٹن نے

جان ڈن Donne کے متعلق کہا تھا:

Did his youth Scatter Poetry, wherein was all Philosophy کیا اس کی جوانی نے ایسی شاعری بکھیری جس میں تمام فلسفہ تھا مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اقبالؔ کی خطابیہ غنائی اور فکری تینوں جہتوں کے بیج یہاں موجود ہیں اور غالبؔ کی عبارت اور اشارت اور ادا کا سایہ بھی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی نظم مرزا غالبؔ میں اُنہوں نے غالبؔ کی روح کو پالیا تھا۔

اقبالؔ کے فن کو سمجھنے میں اور اس کی قدر و قیمت سمجھنے میں جو میلانات حارج ہوتے ہیں ان کا شروع میں ہی ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی زبان پر اعتراض کرنے والوں کے پاس زبان کا ایک جامد تصور تھا۔ وہ زبان کی حفاظت کے علمبردار تھے۔ اقبالؔ زبان کی ترقی کے، اس کے امکانات کے نقیب تھے۔ ان لوگوں کا زبان کا تصور ایک جوئے نرم خرام کا تھا۔ اقبالؔ کا ایک جوے کہستان کا۔ پھر اقبالؔ کی فکر اور ان کے پیام سے وابستگی نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اقبالؔ پرستوں نے ان کی فکر کو اتنی اہمیت دی کہ فن کا تاج محل ایک مزار رہ گیا اور جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے ان کی فکر سے مانوس نہ ہو سکے اُنہوں نے اسے یا تو خطابیہ شاعری کہہ کر ان کے فن کی اہمیت کم کرنی چاہی یا شاہیں کی علامت کی سطحی تاویل کر کے اُس کے ڈانڈے فسطائیت سے ملا دئے۔ جدید نسل نے تو اور بھی ستم کیا کہ اس نے شاعری کے بُت ہزار شیوہ کو سرگوشی، احساس

شکست اور علامت نگاری کے دریچوں سے ہی دیکھا۔ فراقؔ، اقبالؔ کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں مگر انہیں اقبالؔ سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے اسلامی افکار کو کیوں اپنے فن کی بنیاد بنایا اور شاعری کو پیمبری کیوں سکھائی۔ کلیم الدین کو یہ اعتراف ہے کہ ان کے یہاں اچھی شاعری ہے مگر ان کے خیال میں پیام کی لَے اقبالؔ کو لے ڈوبی اور عالمی ادب میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی معیاروں پر ان کی شاعری پوری نہیں اُترتی اور وہ نظم کے ربط و تسلسل سے واقف نہیں تھے۔ جدید نسل نئی بجلیوں کی چمک سے خیرہ ہے، پُرانی بجلیوں سے اس کا رشتہ کمزور ہوگیا ہے۔ اس کی فکر میں جان ہے مگر اس کا فن اپنے کلاسیکی سرمائے سے غفلت کی وجہ سے ابھی تک توانائی حاصل نہیں کرسکا۔

فن کے مطالعے میں سب سے پہلے شعری زبان کے سرمائے پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ گیان چند نے اقبالؔ کے عروضی نظام کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ اقبالؔ ہندی نغمے پر معذرت خواہ ہے اور عجمی خم پر بھی اسے شرمندگی ہے اور صرف حجازی لے اور عربی نوا پر فخر کرتا ہے۔ وہ آسان اور زیادہ مقبول اوزان سے آہستہ آہستہ دور ہوتا جاتا ہے اور اپنے گہرے افکار کے لیے مشکل، دشوار گذار اور رجزیہ قسم کے اوزان کا انتخاب کرتا ہے، خلط مبحث ہے کیونکہ عجمی خم اور عربی نوا سے جیسا کہ گیان چند نے بھی تسلیم کیا ہے طریق فکر و گرمی جذبات مراد ہیں اور جہاں تک بعد میں مخصوص اوزان پر توجّہ کا سوال ہے اس کی وجہ وہ

حِس انتخاب ہے جو موضوع کے لئے مناسب موسیقی اور آہنگ چن لیتی ہے ویسے اقبالؔ کے مزاج میں اگر چہ وہ ہندوستانی فلسفے سے اچھی طرح واقف تھے اور ایک حد تک سنسکرت بھی جانتے تھے جو اُنہوں نے سوامی رام تیرتھ سے سیکھی تھی اس برصغیر کے جنوبی مشرقی ایشیائی، جنوبی ایشیائی اور وسطی اور مغربی ایشیائی تہذیب کے سرمائے میں وسطی اور مغربی ایشیائی سرمائے سے زیادہ گہرا شغف تھا۔ یہ سرمایہ اس لئے قابلِ قدر ہے کہ ہندوستان کی مشترک تہذیب جس پر ہم بجا فخر کرتے ہیں۔ اس وسطی اور مغربی ایشیائی سرمائے کے بغیر مکمّل نہیں ہوتی اور اُردو دپن میں بھی غالبؔ کی شاعری، ابوالکلام کی نثر، اور اقبالؔ کی نظم کا شاندار رول تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ بکھرے خیالات میں اقبالؔ نے لکھا تھا کہ ہماری مسلم تہذیب سامی اور آریائی تصورات کے باہمی ربط ضبط کی پیداوار ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فتح ایران کے بغیر اسلامی تہذیب یک رُخی رہتی۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری تہذیب مرکب تہذیب ہے، اس کی روح عربی ہے مگر اس کا لباس ترک و تاتار و خوانسار اور اصفہان نے تیار کیا ہے۔ میں جو اُردو لکھتا ہوں وہ میری تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ شانِ جلالت رعب و دبدبہ اس کے اوصاف خاص ہیں۔ میں ہندی سے متاثر نہیں ہوں۔ میرے الفاظ کا ذخیرہ عرب سے اور پھر سمرقند و بخارا سے ماخوذ ہے۔ اقبالؔ کی شعری زبان، اس کے عروض و آہنگ، اس کے استعارے اور علامات پر بحث

کرتے ہوئے نہ صرف اس بنیاد کو سمجھنا چاہئے بلکہ اسے تسلیم کرنا چاہئے۔ اقبالؔ کے یہاں ایک بلند تخیّل اور ایک فکری میلان شروع سے ہے۔ مشرقی اور مغربی فلسفے کے مطالعے نے اس میں گہرائی پیدا کی۔ مغرب کے رومانی شعرا کے مقابلے میں تخیّل کو پرواز سکھائی۔ مگر تخیّل کے لئے بال و پر فارسی شاعری نے دئے۔ اُردو شاعری کا لسانی اسلوب غالبؔ سے پہلے محدودیت کا شکار تھا۔ غالبؔ کے اثر سے اقبالؔ نے اس راز کو سمجھا اور فلسفیانہ استفسارات کے لئے سادہ اور پُر پیچ بلاغت کے گُر فارسی سے سیکھے۔ اقبالؔ کے اُردو کلام میں فارسی کے اساتذہ کے جن اشعار کی تضمین کی گئی ہے اُن کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اقبالؔ کے اسلوب کی تشکیل میں ان شعراء کے ساتھ پرواز کے بھی کچھ معنی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اقبالؔ نے رومی کی تمثیلی حکایات کی روایت کو حالی اور شبلی کے واسطے سے زندہ کیا ہے۔ بانگِ درا میں 'شفاخانۂ حجاز' محاصرہ اور نہ ،غلام قادر روہیلہ، صدیق، جنگِ یرموک کا ایک اہم واقعہ صرف موضوع کے لحاظ سے اہم نہیں ہیں۔ ان میں بیان، ڈرامائیت اور شاعری کی تیسری آواز کی ابتدا بھی دیکھی جاسکتی ہے، یعنی مسئلہ صرف حدیث دلبری کا نہیں، صحیفۂ کائنات کا ہے، اسی صحیفۂ کائنات کے لئے اقبالؔ کو وہ اسلوب اختیار کرنا پڑا جو میرے نزدیک Grand Style سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس میں خطابت، غنائیت فکری صلابت تینوں سما گئے ہیں۔

اقبالؔ کے یہاں خطابت پر خاصے اعتراض کئے گئے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک زبان کی آرائش وزیبائش۔ دوسرے ایک خاص عمل کی طرف مائل کرنے کا میلان۔ اقبالؔ کے یہاں دونوں پہلو ہیں۔ طلوعِ اسلام کی خطابت پر کلیم الدین نے اعتراض کیا ہے مگر اس میں مرصع زبان، مروجہ اصطلاحات اور رموز کی معنویت کی توسیع، تغزل سبھی ہے۔ مجھے تو ان اشعار کی خطابت شاعری کے سارے حربوں سے آراستہ معلوم ہوتی ہے۔

مصاف زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریرو پرنیاں ہوجا
گذر جا بن کے سیل تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

اسی طرح شکوے اور شمع وشاعر میں جو خطیبانہ انداز ہے وہ شاعری اور ساحری کے آداب کے مطابق ہے۔ اس لیے شکوے کی شاعری کو جب فیضؔ نے

موچی دروازے کی شاعری کہہ کر اس پر طنز کی تو اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت دیا۔ ہاں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ کہیں کہیں اقبالؔ کی خطابت کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُنہوں نے شعریت کا لحاظ نہیں رکھا۔ مثلاً اسرارِ خودی اور موزِ بے خودی میں یا اُردو کی ان نظموں میں جن میں پیام کی لے بہت اُونچی ہوگئی ہے مگر ترقی پسند شاعری کے سرمائے میں خطابت کی جو بھرمار ہے۔ اس کے مقابلے میں اقبالؔ کی خطابت پھر بھی باادب ہے۔

اقبالؔ کی خطابت پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ان کی غنائیت پر کما حقہ توجہ نہیں ہوئی ہے۔ یہ غنائیت یوں تو بانگِ درا کی بعض نظموں میں بھی اپنی بہار دکھاتی ہے مگر اس کا بھرپور اظہار پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں ہوتا ہے۔ نوائے وقت، سرودانجم، نغمۂ ساربانِ حجاز، کشمیر، تسخیرِ فطرت جیسی نظمیں اور پیام اور زبور کی غزلیں اقبالؔ کے غنائی اسلوب کی اس تازہ کاری اور لالہ کاری کی آئینہ دار ہیں جس کی طرف اقبالؔ کے یہ شعر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

نگاہ می رسداز نغمۂ دل افروزے
بہ معنی کہ بر و معنی سخن تنگ است

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں لالہ، یک خم خانہ مئے

اقبالؔ یوں تو عروض کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے بغیر وہ قصرِ شاعری کی سلامتی نہیں سمجھتے مگر ہر بڑے فن کار کی طرح قید کی حد میں آزادی کی حد بڑھا لینے کی اُنہوں نے جو مثالیں پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں پیش کی ہیں اور قطعات کو اُنہوں نے جس طرح رباعیات کا نام دیا ہے اُن سے اُن کے فنّی شعور کی لچک ظاہر ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے یہاں آوازوں کا جو سنگیت ہے اس سے بھی ان کا کمالِ فن ظاہر ہوتا ہے۔ ایک شام (دریا نیکر کے کنارے) کے صوتی حسن کی طرف کئی نقادوں نے اشارہ کیا ہے۔ عابد علی عابدؔ نے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ وہ اندرونی قافیے سے سبڑا کام لیتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس سے زیادہ اہمیت لہجے کی ہے۔ نیا شوالہ کا لہجہ اور ہے، عبدالقادر کے نام کا اور، گورستان شاہی کا اور، شکوے کا اور، جواب شکوے کا اور اسی طرح خضرِ راہ کے لہجے اور طلوعِ اسلام کے لہجے میں فرق ہے اور فرق اس وجہ سے ہے کہ فن کار زبان پر قدرت رکھتا ہے اور موضوع یا خیال یا تجربے کے لحاظ سے الفاظ کے در و بست، ان کی آوازوں اور ان کے لہجے کے فرق کو مدّ نظر رکھتا ہے مگر ہر لہجے میں اپنی افادیت باقی رکھتا ہے۔ خطابت اور غنائیت کے علاوہ اقبالؔ کے اسلوب فن میں فکر کی جو

گہرائی، توانائی اور تب وتاب ہے اس کی وجہ سے ان کی نظمیں ہی نہیں غزلیں بھی اُردو اور فارسی میں ایک نئے رنگ وآہنگ کا اضافہ کرتی ہیں۔ میں یہاں فلسفی اقبالؔ کا ذکر نہیں کررہا ہوں۔ اس شاعر کا ذکر کررہا ہوں جو مشرق ومغرب کے فلسفے کے بحرِ ذخار کا شناور اور تاریخ اور جدید علوم کا رمز شناس ہے۔ اس دولت نے اقبالؔ کے تجربے کو ایک تنظیم، معنویت اور وژن عطا کیا ہے۔ اسے Prophetic Vision کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ وژن ہے جس کی کمی انگریزی کے رومانی شعرا کے یہاں آرنلڈ کو محسوس ہوئی تھی (They did not know enough) یہ دید و دانش کا بصیرت ومعرفت کا وژن ہے، جس کے عقل پرسوز اور ادب خوردۂ دل ہے۔ یہ عالمیت کے لئے ایک نئی مشرقیت کا وژن ہے۔ جس کے بیان کے لئے فارسی تراکیب کی بلاغت، استعارے کی طرحداری اور علامت کی پہلوداری کو اقبالؔ نے اس طرح سمولیا ہے کہ شاعری حیات وکائنات کے سارے مسائل کے اپنے طور پر اظہار پر قادر ہوگئی۔ بانگِ درا میں اقبالؔ کی نظم ارتقا، بالِ جبریل میں ساقی نامہ اور زمانہ اسی رنگ کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہاں فلسفے کی نہیں فکری شاعری کی جلوہ گری ہے نظم ارتقا کے یہ شعر دیکھئے۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفاطلبی

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشاکش رم و گرماتپ و تراش و خراش
زخاک تیرہ دروں تابہ شیشہ جلّی
مقام بست و شکست و فشارو سوز و کشید
میان قطرہ نیساں و آتش عنبی

-----☆-----

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سُلجھنے میں لذّت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت کہسار سے فوج موج
گُل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اُسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

-----☆-----

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ

اقبالؔ کا فن اعلیٰ سنجیدگی کا فن ہے اور اس اعلیٰ سنجیدگی میں جلال اور جمال ،جلال کے جمال اور جمال کے جلال کا خوبصورت امتزاج ہے۔ فنکار لفظوں کے معاملے میں فضول خرچ نہیں، کفایت شعار ہوتا ہے، اقبالؔ نے اس کفایت شعاری کا اظہار بلاغت کے ذریعہ سے کیا ہے۔ بلاغت سادہ بھی ہوسکتی ہے اور پُر پیچ بھی۔ اقبالؔ کے یہاں بلاغت ایسی تراکیب میں ملتی ہے جو معنی آفرینی،

حسن آفرینی، اور اختصار تینوں کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں اور ان کی تخلیقی طرحداری اور مزاج کے شکووں کی نمائندہ مثلاً خون رگ کائنات، سوز درون کائنات، احتساسات کائنات، عالم بے ہائے ہو، عالم احوال وافکار، عالم جذب وسرور، ستیزہ گہ جہاں، مصاف زندگی، ممکنات زندگانی، جنون زندہ دلاں، مقراضِ حیات، نسخۂ اسرار تکوین کائنات، گرداب وجود، معرکہ بود ونبود، مذہب ملا وجمادات ونباتات، فقرِ غیور، گناہ عشق ومستی، صنم خانۂ دل، ادب خوردہ دل، رقص جاں، جان جلوۂ مست، عشق بلاخیز، شاہین عشق، غواص محبت، عقل بلند دست، عقل آذر پیشہ، گماں آباد حکمت، فلسفۂ روباہی، روشنی دانش فرنگ، فساد قلب ونظر، مستی اندیشہ ہائے افلاکی، درویش خدامست، شب افکار مشرق، فکر مدرسہ وخانقاہ، غزالانِ افکار، بت کدہ تصورات، اندیشہ وکمال جنوب، نعمہ جبریل آشوب، مردانِ جفاکش وہنرمند، مردان گراں خواب، صاحب فراز ونشیب، مقام شاہ بازی، ذوق آتش آسای، ذوق شکرخند، نیش ونوش آرزو، گرفتار طلسم چشم وگوش، لذت سیل تندرو، بہ دل آبجو، لذت صوت وصدا، دردوسوز آرزومندی، دم نیم سوز، گرمی ہنگامہ آتش نفساں، رہ ورسم خانقاہی، مزاج خانقاہی، شیوۂ آدم گری، خودسردہ وخود مرقد وخود مرگ مفاجات، بندۂ مولاصفات، بندۂ دریامست، افسون بندگی، عشرت خواجگی، ضرب تازیانہ، تسخیر خاکی ونوری، غوغائے رستاخیز، تب وتاب جاودانہ، شعلۂ نم خوردہ، زیر وبم ممکنات، شیشہ گراں فرنگ، آلودۂ

انداز فرنگ۔

اقبالؔ کی تراکیب کے علاوہ ان کے تشبیہات اور ان کے استعارات میں بھی ان کے فن کی طرحداری اور رعنائی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ شروع میں اقبالؔ کے یہاں تشبیہات کی فراوانی ہے۔ شاعری کے عروج کے زمانے میں استعارات کی جن میں سے کچھ علامتی طور پر استعمال ہوتے ہیں اور آخر میں وہ برہنہ گوئی ملتی ہے جو بقول ایلیٹ اپنی ہڈیوں میں ٹھٹھری ہوئی ہے۔ ہماری پرانی تنقید میں تشبیہات اور استعارات کو صنایع کے ذیل میں رکھا جاتا تھا اور ان کے آرائشی پہلو پر زیادہ توجہ ہوتی تھی۔ اب جا کر یہ احساس ہوا ہے کہ استعاراتی بیان جس میں تشبیہہ، استعارہ، علامت سبھی آجاتے ہیں شاعری کا ایک بنیادی وظیفہ ہے۔ کچھ لوگ خوابیدہ یا منجمد استعارے استعمال کرتے ہیں اور جن کی تخلیقی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے وہ جاگتے ہوئے، حرکی، پر جوش استعارے برتتے ہیں۔ ذوقؔ پہلی صف میں آتے ہیں۔ غالبؔ دوسری صف میں اور اس صف کے ایک ممتاز فرد اقبالؔ ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں ابتدا ہی سے ہلالِ عید کے لئے حلقۂ پرطاؤس، رکوع، سورۂ نور اور کاسہ سوال جیسی نادر تشبیہیں نظر آتی ہیں۔ اور ہمالہ اور جگنو جیسی نظموں میں تشبیہات اور استعارات ایک تو شاعر کے خیال کا رقص ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری یہ شاعری کے جادو کو ایک رفعت ایک فضائے بلند عطا کرتے ہیں۔ بزمِ انجم میں شام کا منظر آرائشی ہے۔ مگر جگنو

یرموک کا پہلا شعر حسن کاری کے جلال اور فضا بندی استعارے کا مرکزی کردار نمایاں کرتا ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروس زمینِ شام

اقبال کی تشبیہوں کی ندرت خضرِ راہ کے دو اشعار کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔

وہ نمود اختر سیماب پاہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبین جبرئیل

ستارے کی روشنی کے لئے جبین جبریل کی تشبیہ اس لئے نادر ہے کہ جبریل کو کسی نے دیکھا نہیں مگر عقیدے نے جو مذہبی اور تہذیبی سرمائے سے ملا ہے اس ان دیکھی ہوئی مثال کو ہر دیکھے ہوئے منظر سے زیادہ پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ ایسا ہی ایک اور شعر ہے۔

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

ان کی دلآویز تشبیہات میں شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل اور ریگ نواح کا ظمۂ نرم ہے مثل پرنیاں، اور ان کے جمیل اور جلیل استعاروں میں گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا، بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی، اور عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے۔ یا اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ۔ دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی۔ نیز ساقی نامہ میں جوئے کہستاں کے علاوہ کتنے ہی جادوئی استعاروں کی مدد سے ایک فلسفے کو پگھلا کر شعریت کا لاوا بنایا گیا ہے۔ یہی بات زمانہ اور لالہ صحرا میں ہے۔

اقبالؔ کے تشبیہات و استعارات رفتہ رفتہ نشانات اور پھر علامات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نشانات قطعی اور صاف صاف ہوتے ہیں۔ علامات نیم شفاف۔ اقبالؔ کے یہاں اس طرح کے من مانے اور ذاتی علامات نہیں ہیں جو فرانسیسی علامت پرستوں یا بعض جدید شعرا میں عام ہیں۔ ان کی علامت نگاری ابلاغ کی ضرورتوں کی وجہ سے اپنے مذہبی اور تہذیبی سرمائے سے جانی پہچانی علامات لیتی ہیں اور ان میں اپنے سوزِ نفس سے ایک نئی زندگی، ایک نئی معنویت اور ایک نیا جادو بھر دیتی ہیں۔ مثلاً شاہین، آہو، لالہ، تلوار، درویش (درویش خدامست)، عشق، قلندر، پروانہ، جگنو، شاہین کی علامت کے سلسلے میں ان نقادوں نے اقبالؔ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جو اسے صرف مغربی عینک سے

دیکھتے ہیں۔ اقبالؔ کا تصور مشرقی ہے۔ اقبالؔ نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ روح تیمور سے تیموریت اور چنگیزیت مراد نہیں ہے یہ ایک اسلوب بیان ہے۔ اسی طرح شاہین ایک علامت ایک اسلوب بیان ہے جس کی وضاحت خود اقبالؔ نے کردی ہے۔ آہو مستقل اور متحرک مزاج کی تصویر ہے۔ جیسے ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پرواخرام۔ یا زکمند شہر یاراں رم آہوانہ دارم۔ خواجہ منظور حسین نے درست کہا ہے کہ ''شاہین سے کہیں زیادہ شعری بلاغت اور لطف آہو اور لالہ کے استعمال میں ملتا ہے۔ یہ دونوں ملّت بیضاوی کی سرگذشت، تہذیب مجازی کے مدوجزر اور اپنے شاعر کی تخلیقی مزاج کے متنوع کیفیتوں کے نشان ہیں۔ ان علامتوں کی جذباتی کش مکش میں ان کے صحرائی وجود کو بالخصوص دخل ہے''۔ منزل ہے کہاں تیری، اے لالۂ صحرائی، اور نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے، اور عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب، علامت کی دنیا اور لفظ کے کائنات بننے کی بڑی کامیاب مثالیں ہیں۔ بوطیقا کی شعریت کے مطابق اقبالؔ اپنے استعاراتی نظام کی وجہ سے بڑے فن کار ہیں۔ اقبالؔ کے فن کی بحث میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ نظم نگار کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتے ہیں اور اُنہوں نے اُردو نظم کو کیا دیا ہے۔ کلیم الدین کو اقبالؔ کے یہاں ربط و تسلسل اور تعمیری صلاحیت کی کمی نظر آتی ہے، مگر کلیم الدین کی تنقید کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں پس وپیش نہیں کہ کلیم الدین کی مغربی عینک ان کی نظر میں ایک ایسا کٹر پن پیدا

کر دیتی ہے جو شعریت کے اُردو نظم گوئی کے ایک ہی سانچے کو پہچان سکتی ہے۔

ہماری نظم جدید حالؔی اور آزادؔ، اسماعیلؔ اور اکبرؔ کے سہارے پروان چڑھی مگر اسے بلوغت اقبالؔ نے ہی عطا کی۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اقبالؔ نے مسدس کی صنف کو کیوں جواب شکوے کے بعد ترک کر دیا۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ارتقائے خیال اور آغاز وسط اور تکمیل کا احساس ملتا ہے اور ان کی درجنوں چھوٹی نظمیں تعمیر، تنظیم اور ربط و تسلسل کے نمونے پیش کرتی ہیں۔ ہاں یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے کہ اقبالؔ چونکہ غزل کی روایت سے یکسر بلند نہیں ہو سکے اس لئے ان کے یہاں طویل نظمیں دراصل خوبصورت ٹکڑوں کا ایک گلدستہ ہوتی ہیں، یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ایڈگر ایلن پوتو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ طویل نظم کوئی چیز نہیں، یہ مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔ اقبالؔ کی وجہ سے اُردو نظم جوان ہوئی اور اس میں جوانی کی لغزشیں بھی ہیں مگر اقبالؔ نے غزل کی دنیا میں جو انقلاب برپا کر دیا اور اسے جو عظمت، گہرائی اور برگزیدگی عطا کی اس کا اعتراف ضروری ہے۔ وقار عظیم نے کہا ہے کہ اقبالؔ نے نظم کو تغزل دیا۔ یہ صحیح ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اُنہوں نے غالبؔ کے کوزے کو دریا بنا دیا اور حدیثِ دلبری کو صحیفۂ کائنات۔ اقبالؔ کے یہاں شاعری کی پہلی اور دوسری آوازوں کا تو بھرپور نقش ہے، مگر تیسری آواز بھی جبریل و ابلیس میں

پورے طنطنے کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں منظوم فلسفہ بھی ہے مگر خطیبانہ شاعری، غنائی شاعری، مفکرانہ شاعری Epigramatic شاعری سب ، کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ عمدگی Excellence ایک قسم کی نہیں ہوتی۔ فریاد کی بھی ایک لے نہیں ہے ہمارے یہاں ابھی نظر نہیں ہے ہاں نظریہ سازی ہے، جس کی وجہ سے ہم فن کے جلوۂ صد رنگ کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہر فن ایک یقین اور اس کے استناد کی ایک وژن میں جلوہ گری ہے۔ کیا ہوا گر اقبالؔ نے غالبؔ یا شیکسپیر کی طرح زندگی کی کثرت پر نظر جمانے کے بجائے اس میں ایک وحدت کی تلاش کی۔ اُنہوں نے اس تلاش کو بھی فن بنا دیا۔ اُردو شاعری اب دوسرا اقبالؔ پیدا نہ کر سکے گی۔ مگر اقبالؔ کا فن موجود اور آنے والے فن کاروں کے لئے روشنی کا ایک مینار رہے گا۔ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اقبالؔ کے اس شعر پر یہ عمومی جائزہ ختم کیا جاتا ہے۔

آنچہ او در بزم شوق آوردہ می دانی کہ چسیت
یک چمن گل، یک نیستاں لالہ، یک خم خانۂ مے

فن، گل، لالہ ا مئے کے سہ آتشہ کا ہی تو نام ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی

شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت

اقبالؔ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ ان کے وطن ہندوستان اور پورے مشرق کی بدترین غلامی کا دور تھا۔ مغربی سامراج پورے ایشیا و افریقہ پر مسلّط تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کا تمدن زندگی کے ہر دائرے کو پوری دنیا میں بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ سیاست، معیشت، معاشرت اور علوم وفنون سب اس غیر متوازن مادیت کے شکار ہو رہے تھے جو یورپ میں صنعتی انقلاب، سائنسی انکشافات اور تکنیکی ایجادات کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی تھی۔ طرح طرح کے نظریات ذہن و کردار پر اثر انداز ہو کر انسان کی شخصیت اور سماج کی قدروں میں انحرافات کا سامان کر رہے تھے۔ ایک طرف انیسویں صدی کی ساکن و جامد زندگی ختم ہو رہی تھی اور دوسری طرف بیسویں صدی کے تخریبی ہنگامے شروع ہو رہے تھے۔ مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کے ردِّ عمل میں ایک انتہا پسندانہ اجتماعیت کے میلانات ابھر رہے تھے، جب کہ مشرق میں معاشرے کا

انتشار افراد کے اضمحلال کا باعث ہو رہا تھا۔ حاکم و محکوم، امیر و غریب اور سرمایہ دار و محنت کش کا فرق و امتیاز روز افزوں تھا۔ حقوق یافتہ طبقات نہایت خود غرضی کے ساتھ اپنی عیاشی کے لئے محروموں اور مفلسوں کا استحصال کر کے انہیں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ہر قوی ہر کمزور پر جبر و ستم کر رہا تھا۔ عوام و خواص کی تفریق بڑھ رہی تھی استبداد اور اجارہ داری کے رجحانات نمایاں تھے۔ تہذیب کے پردے میں وحشت غالب آ رہی تھی۔ فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا، عالمی سطح پر قوم پرستانہ مفادات کی کش مکش ایک جنگ عظیم برپا کر چکی تھی اور دوسری جنگ کی فضا تیار کر رہی تھی۔ مشرق بالخصوص ہندوستان میں آزادی کی جو تحریک چل رہی تھی اس میں فرقہ پرستی کے عناصر نمایاں ہو رہے تھے۔ عام انسانی حریت، مساوات اور اخوت کا فقدان ہو چکا تھا۔ ترقی کے نام پر ہر کوشش زوال کے عمل کو تیز کر رہی تھی۔ بین الاقوامیت کا مظاہرہ آفاقیت کی قیمت پر تھا۔ امن کے دعوے جنگ کے بہانے بن گئے تھے۔ انسانیت تباہی کے دروازے پر کھڑی تھی اور حیوانیت کا بول بالا تھا۔ بقا کی جدوجہد سے فنا کے قرینے عیاں تھے، ارتقا کا رخ انحطاط کی طرف تھا۔

اس صورتِ حال کی ذمے داری فکری اعتبار سے فلسفہ و ادب کے ان غلط تصورات پر عائد ہوتی تھی جو یورپ کے دانش کدوں سے نکل کر امریکہ ایشیا اور افریقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں بالآخر امریکہ یورپ کے ساتھ مل

کر مغرب کا ایک حصّہ بن گیا، جب کہ مغربی محاذ کے مقابلے میں ایشیا و افریقہ پر مشتمل مشرق شکست خوردگی اور پس پائی سے دوچار ہوا۔ مادی لحاظ سے ترقی یافتہ مغرب ایک پس ماندہ مشرق پر ہر جہت سے فرماں روائی کرنے لگا۔ علم اور تعلیم کے میدان میں مغرب کی فتوحات نے مشرق کو بالکل مرعوب کر دیا۔ چنانچہ مشرق کی ذہنی غلامی اس کی سیاسی غلامی سے بھی زیادہ خطرناک ہوگئی اور غلام مشرق کی روحانی نسل کشی کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ وسائلِ معیشت کی تنگی کے ساتھ ساتھ اخلاق واقدار کی تباہی مشرق کے مستقبل کو ایک سوالیہ نشان بنانے لگی۔ لہٰذا اشد ضروری ہوگیا کہ فلسفہ وادب کے دائروں میں مغرب کے چیلنج کو قبول کیا جائے، تاکہ عصرِ حاضر میں فسادِ آدمیت کا سرچشمہ بند ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ تاریخ کی رفتار پر پابندی لگائی جائے اور زمانے کی رَو پلٹ جائے۔ سوال صرف تاریخ کے رخ اور زمانے کے انداز کو بدلنے کا تھا، تاکہ دورِ جدید میں کاروانِ انسانیت اپنی گم شدہ منزل کا پتا پاسکے اور اس کی سمت میں آگے بڑھے، یعنی صحیح معنوں میں ارتقا کا اگلا قدم عروج آدم خاکی کی جہت میں اٹھے اور تخریب کے بجائے تعمیر کا سامان پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے مغرب کی صنعتی، سائنسی اور تکنیکی ترقیات کو انسانیت کا مشترک ورثہ سمجھ کر اختیار کرنا تھا۔ اسی طرح تحقیق وتنقید کے معاملے میں طریق کار کے جو کمالات یورپ میں جدید ترین وسائل کی بدولت رونما ہوئے تھے انہیں حاصل کرنا بھی مناسب ومفید تھا۔ صرف مقاصد کی تبدیلی

درکار تھی، جس کے لیے وسعتِ نظر، بلندیِ خیال، حقیقت پسندی اور بصیرت مندی کی ضرورت تھی۔ رائج الوقت علوم وفنون کو سیکھ کر ان سے میّسر آنے والے ذرائع کا صحیح استعمال کرنا تھا۔

لیکن اس نظریاتی انقلاب کا مقصود ایک بہتر عمل تھا، سیرت و کردار کی اصلاح تھی۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس جمود کو توڑنا تھا جو مشرق پر طاری ہو چکا تھا اور نتیجتاً اس کے قوائے عمل اگر مفلوج نہیں تو مضمحل ہو چکے تھے، ایک قسم کی سکون پرستی علماء، صوفیا، ادبا اور شعرا کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی، اس لیے کہ حالات سے مایوس ہو کر اُنھوں نے گوشۂ عافیت ہی میں راحت محسوس کی۔ یہ علامتِ مرگ تھی۔ لہٰذا حیات افروزی کا تقاضا تھا کہ امید و آرزو سے سرشار ہو کر حرکت و کاوش سے کام لیا جائے اور ہمت و جرأت کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم بڑھایا جائے، مشکلات کا مقابلہ کیا جائے اور ہر حال میں حوصلے بلند رکھے جائیں۔ بے سروسامانی کی حالت میں بھی جدوجہد ہی وہ کلید تھی جس سے سارے مسائل حل ہو سکتے تھے۔

بہر حال، مشرق و مغرب کی صف آرائی کا مطلب انسانیت کو خانوں میں تقسیم کرنا نہیں تھا، جس طرح وطن پرستی غلط تھی اسی طرح خطّہ پرستی بھی۔ علاقائیت اور قبائلیت ایک مذموم و مُضر ذہنیت تھی۔ تعصّب خواہ فرقہ پرستی کا ہو یا قوم پرستی کا، شائستگی اور بالیدگی کے خلاف تھا۔ نسل و رنگ، زبان، ملک، مرتبے

اور دولت کے امتیازات فطرت کے قوانین کو توڑنے اور انسان کو بربادی کی راہ پر لگانے والے تھے۔ لہذا اصلاح و انقلاب کے مراحل جس تدریج و ترتیب سے بھی طے پائیں، ان کا مطمحِ نظر آفاقی ہونا چاہئے۔ عصرِ حاضر میں عالمی سطح پر پوری انسانیت کی نشاۃِ ثانیہ درکار تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان اور مشرق کے اندر بڑے بڑے مفکر اور رہنما پیدا ہوئے۔ لیکن ان میں کم ہی ایسے تھے جو قدیم علوم کے ساتھ جدید علوم پر بھی دست رس رکھتے ہوں اور دونوں کی جامعیت کے ساتھ قیادت کا فرض انجام دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ علوم کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کی جو آگہی اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے جو بصیرت مطلوب تھی وہ گویا مفقود تھی۔ زمانے کا تیور پہچان کر مسائل کی جڑوں کا سراغ لگانا بے حد مشکل تھا، اس لئے کہ سارا عالم ایک غلط اقتدار کے طلسم میں اسیر تھا۔ مغرب کے دانش وروں اور قائدوں کی نگاہوں پر بھی پردے ہوئے تھے، وہ اپنے تخیلات کے جادو میں گرفتار تھے اور اپنے طرزِ فکر میں کسی تبدیلی کے روادار نہیں تھے۔ وہ بعض اوقات واقعات سے مجبور ہو کر جو کچھ نئے تجربات کر رہے تھے وہ بھی پرانے ہی رخ پر ہوتے تھے اور بسا اوقات ماحول کو بہتر بنانے کے بجائے بدتر کر دیتے تھے۔ کائنات میں حیات کی نوعیت اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے مطابق کوئی نظامِ تمدن موجود نہیں تھا۔ ارتقا کا تصور تک حقائق سے

زیادہ اوہام پر مبنی تھا۔ روایتی مذہب کے اساطیر سے بڑھ کر گمراہ کن سائنس کی خرافات تھیں۔ صداقتوں سے صرفِ نظر کر کے یا تو خواہشات یا قیاسات پر انحصار کیا جا رہا تھا۔ ایک آفاقی تہذیب کی انسانی قدریں ناپید یا متروک تھیں۔

اس تناظر میں اقبالؔ نے اصلاحِ احوال کے لئے خودی کا نظریہ پیش کر کے عصرِ حاضر میں انسانیت کی تشکیلِ جدید کا ایک نقشہ مرتب کیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں سے ۱۹۳۸ء تک تقریباً چالیس سال ایک تسلسل کے ساتھ اقبالؔ اپنے افکار و خیالات کا متواتر اظہار تحریر و تقریر، نظم و نثر اور فکر و عمل کے ذریعے اردو، فارسی اور انگریزی میں کرتے رہے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے متعدد اہم ممالک کے سفر بھی کئے۔ متعلّم، معلّم، وکیل اور سیاست داں کی مختلف حیثیتوں سے ان کے مطالعات و مشاہدات اور تجربات و اقدامات نے انہیں آج کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے براہ راست ادراک کا موقع دیا۔ اپنی تربیتِ ذہنی کے لحاظ سے وہ یقیناً ایک فلسفی تھے، لیکن ان کے وارداتِ قلبی نے انہیں ایک قلندر یا درویش بنا دیا۔ اس طرح ان کی شخصیت میں عقل و عشق کا توازن پیدا ہوا۔ ساتھ ہی ان کے کردار کی حرکیت نے انہیں جدوجہد پر آمادہ کیا۔ لہذا وہ ایک حقیقت پسند عملی انسان بن گئے اور وسعتِ نظر کے ساتھ ٹھوس منصوبے بنانے کے قابل ہوئے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے اپنے وطن ہندوستان کی آزادی و ترقی کو اپنے عزائم کا نشانہ بنایا۔ لیکن ابتدا ہی میں انہیں ملک کی فرقہ

وارانہ صورتِ حال کا اتنا شدید احساس ہوا کہ بانگِ درا کے حصہ دوم (۸۔ ۱۹۰۵ء) کی ایک نظم ''پیامِ عشق'' میں انہیں کہنا پڑا:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اس شعر میں فرقہ سازی کو آزری کہا گیا ہے یعنی بت پرستی قرار دیا گیا ہے، جب کہ غبارِ راہ حجاز ہونا خدا پرستی کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ ملکی سیاست کی فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرنا اقبالؔ نے اپنا دینی عقیدہ اور مذہبی فریضہ تصور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد ملّت پروری کی طرف مائل ہو گئے، گرچہ ان کی وطن دوستی میں آخر سانس تک کوئی فرق نہیں آیا اور ان کی موت بہر حال غیر منقسم ہندوستان میں ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کو ملک کی آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر اقبالؔ نے اس مسئلے کا جو اصولی حل، خاص کر شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کے استقلال کے لئے، پیش کیا وہ غلام ہندوستان کے بلا امتیاز تمام سیاسی رہنماؤں کے عمل کے نتیجے میں پاکستان اور تقسیم ہند کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس سلسلے میں جو قتلِ عام ہوا، انسانی رشتے منقطع ہوئے اور پڑوسی ممالک آج تک ایک دوسرے کے مقابلے میں

صف آرا ہیں اس کی سب سے زیادہ مذمت، اگر وہ زندہ ہوتے تو، اقبال ہی کرتے۔

بہر حال، اقبالؔ کی ملت پروری ایک اصولی نظریے پر مبنی تھی۔ وہ اپنے تصور اسلام کو حریّت، مساوات اور اخوت کا واحد نصب العین سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے حکمتِ افرنگ پر تفریق ملل کا الزام رکھ کر ''اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم'' اور مغربی سیاست کی قائم کی ہوئی ''جمعیتِ اقوام'' کے بجائے ''جمعیتِ آدم'' قرار دیا، (''مکّہ اور جنیوا''۔۔۔ضرب کلیم)۔ اس آفاقی ملت و جمعیت کے قیام کے لئے اقبالؔ کے خیال میں صورتِ حال کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ سب سے پہلے پورا مشرق مغرب کی غلامی، استعمار اور استحصال سے آزاد اور محفوظ ہو جائے، یورپ کا عالمی استبداد اور اجارہ داری ختم ہو، ایشیا اور افریقہ کو استقلال و اختیار حاصل ہو، تا کہ تمام اقوام و ممالک برابری کی سطح پر ایک انسانی برادری کے لئے کوشاں ہوں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب اہلِ مشرق کا زوال دور ہو، وہ اپنے آپ میں آجائیں، اپنی گم شدہ قدروں کی بازیافت کریں اور جدید تاریخ میں پورے اعتماد کے ساتھ اپنا وہ تعمیری رول ادا کر سکیں جس سے اہلِ مغرب کی تنگ نظری، خود غرضی اور چیرہ دستی نے انہیں محروم کر دیا تھا۔ لہٰذا اقبالؔ نے اپنا اوّلین مخاطب ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ پورے مشرق کو بنایا، گرچہ ان کا مطمع نظر پورے عالمِ انسانیت سے کم کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایشیا و

افریقہ کے اکثر ممالک مذہباً مسلمان ہیں اور ان کا آبادی کا بیشتر حصّہ اسلام پر ایمان رکھتا ہے۔ چانچہ مشرق اور ملت اقبالؔ کی نگاہ میں ایک تھے اور وہ اپنے نقطہ نظر سے سمجھتے تھے کہ ''ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات'' (دنیائے اسلام۔۔خضرراہِ) ''انہیں سرگذشتِ ملّت بیضا میں یہ نکتہ عیاں نظر آتا تھا کہ مسلمان ''اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں'' ہے (طلوعِ اسلام)۔اس سلسلے میں اقبالؔ عملی طور پر بہ وجوہ ہندوستان کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ آج کی دنیا کے تاریک افق پر ''شعاعِ امید'' (ضربِ کلیم) بن کر چمکنے کی جو آرزو رکھتے تھے اس کا مطلع تو مشرق تھا، جس کے ہر ذرّے کو وہ ''جہاں تاب'' بنانا چاہتے تھے، لیکن ''خاور کی امیدوں کا مرکز'' خاکِ ہند تھی، جس کی ''تاریک فضا'' ''اقبالؔ کے اشکوں سے سیراب'' ہو رہی تھی۔ اس لحاظ سے مشرق میں ملّت کے استحکام اور فروغ کی سب سے زیادہ توقع بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان سے تھی۔ یہ توقع شاعر کی وطن دوستی کے ساتھ ہی ایک حقیقت پسندی پر بھی مبنی تھی، اس لئے کہ ذہنی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری عالمِ اسلام کے لئے بھی ایک نمونہ تھی۔ برطانوی سامراج کے خلاف تحریکِ آزادی کی جدوجہد ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کرنی تھی۔ اسی لئے اقبالؔ نے بیک وقت بت خانے کے دروازے پہ سوئے ہوئے برہمن اور تہِ محراب تقدیر کو روتے ہوئے مسلمان دونوں کے نام بیداری اور سخت کوشی کا پیغام نشر کیا، تاکہ

سیاسی سطح پر ان کا باہمی اتحاد و اشتراک برطانیہ جیسی وقت کی سب سے بڑی طاقت کو مشرق کے ایک قدیم و عظیم ملک کی آزادی کا پروانہ جاری کرنے پر مجبور کر سکے، جس کے بعد ایشیا و افریقہ کے دیگر ممالک کی آزادی کا راستہ ہموار ہو جانے کی امید تھی اور وہ پوری بھی ہوئی۔

شعاعِ امید دراصل مشرق و مغرب دونوں کے لئے تھی، مظلوم مشرق کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے اور ظالم مغرب کو ظلم سے باز رکھنے کے لئے، تاکہ دونوں ایک انسانی سطح پر آ کر عصرِ حاضر میں ''زندگی کی شبِ تاریک سحر'' کر سکیں (''زمانہ حاضر کا انسان''۔۔۔ضربِ کلیم) یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مغربی طاقتوں پر ترکوں کی فتح کو ''طلوعِ اسلام'' قرار دیتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا:

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

محبت کی اس چنگاری کو اقبالؔ فروغِ انسانیت کا پیام دیتے ہیں:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اس لئے کہ:

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

چنانچہ شاعر نے اہلِ مغرب کو خبردار کیا:

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حدزاے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

''مرگ خودی'' جس طرح مشرق پر طاری ہوئی تھی مغرب پر بھی اسی طرح سایہ فگن تھی:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
(ضربِ کلیم)

لہٰذا اقبالؔ مغرب و مشرق دونوں کو آفاقیت کا درس دیتے ہیں:

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
(''شاہیں''۔۔۔۔بالِ جبریل)

اقبالؔ کا نظریۂ خودی فی الواقع ہندوستان، مشرق، نوعِ انسانی اور ملّت اسلامیہ سب کے لئے تھا، اس لئے کہ اس کا نصب العین عروجِ آدمِ خاکی تھا۔ جیسا ہم دیگر نظموں اور غزلوں کے علاوہ جاوید نامہ کے ''نغمۂ ملائک'' میں دیکھ چکے ہیں، اقبالؔ کی آرزومندانہ پیش گوئی یہ تھی:

فروغِ مُشتِ خاک ازنوریاں افزوں شود روزے
زمیں ازکوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے

ایک وقت آئے گا کہ مشتِ خاک فروغ پاکر بالآخر فرشتوں سے آگے بڑھ جائے گی اور اسے ملائکہ پر جو فضیلت روزِ ازل دی گئی تھی اس کی تکمیل کا نظارہ دنیا مادی طور پر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی، اور گویا زمین ہی انسان کی تقدیر کے مطابق آسمان بن جائے گی۔ بالِ جبریل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ فرشتے کس طرح آدم کو اس کی کائناتی اہمیت جتا کر جنّت سے رخصت کرتے ہیں اور روحِ ارضی کس ولولے کے ساتھ آدم کا استقبال کرتے ہوئے اس کی تسخیرِ کائنات اور لامتناہی ترقی کے حقائق اسے بتاتی ہے۔ اس ترقی میں مشرق و مغرب کے ساتھ قدیم و جدید کی بھی کوئی تمیز نہیں، اس لئے کہ اقبالؔ کا تصورِ زمان آفاقی ہے:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصّہ جدید و قدیم
(''علم اور دین''۔۔۔ضربِ کلیم)

انسانی خودی کا ارتقا لامحدود ہے:

ازل اس کے پیچھے ، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
(''ساقی نامہ۔۔۔بالِ جبریل)

آدمی کے عروج کی ایسی نغمہ سرائی دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کی ہے اور کائنات میں حیاتِ انسانی کے مسائل پر جتنی بحث کلامِ اقبالؔ میں ملتی ہے دوسرے کسی شاعر کے یہاں نہیں۔ لہذا اقبالؔ عظیم ترین شاعرِ مشرق ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم ترین شاعرِ انسانیت بھی ہیں۔

ان دونوں مرکب حیثیتوں سے اقبالؔ نے جو نظریہ خودی مرتب کیا اس میں فرد و جماعت، دین و دنیا، فکر و عمل اور خدا و انسان کا مکمل ارتباط ہے، یہ ترکیب و ترتیب مجموعی اور عمومی طور پر تضادات سے خالی اور تعصّبات سے پاک ہے۔ انفرادیت و اجتماعیت کے پس منظر میں خودی و خدا کے تعلق کی یہ لطیف تعبیر دیکھئے:

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہوجا
(''پیامِ عشق''۔۔۔۔بانگِ درا)

فرد کو مجازی اور جماعت کو حقیقی جس نسبت سے قرار دیا گیا ہے وہ کوئی معمولی معاشرتی واقعہ نہیں ہے۔ دنیا میں انسان آتے اور یہاں سے جاتے رہتے ہیں، لیکن انسانیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے، تمدن اور تہذیب کی ترقی صدیوں سے ہورہی ہے، تاریخ میں بڑی بڑی شخصیتیں ابھریں اور اپنا کام کر کے رخصت ہوگئیں، مگر کام ختم نہیں ہوا، اس لئے کہ سارے افراد اپنی اپنی باری پر صرف مشیتِ الٰہی کے ایک وسیع منصوبے کی تعمیل کررہے ہیں اور اسی لحاظ سے فنا میں بھی اپنی بقا کا سامان کررہے ہیں۔ یہ کائنات کی سب سے اہم حقیقت ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اسی حقیقت کا عکس یا اس کی علامت ہے، یعنی نسبتاً مجازی ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ نہیں کہ خودی کا وجود مشتبہ ہے، بلکہ فی الواقع یہی بات خودی کے محکم، پائدار اور لازوال ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ ہر فردِ بشر کی خودی پوری کائنات کی خودی کا یک جُز ہے، یہ آفاقی خودی خدا کی خودی ہے جس سے وابستہ اور ہم آہنگ ہوکر ہی انسان کی خودی معتبر و موثر ہوتی اور اپنے نقوشِ عمل کے اعتبار سے ہمیشہ باقی رہتی ہے، موت بھی اسے فنا نہیں کرسکتی، اس کی

ہستی کا سلسلہ عدم سے دنیا اور دنیا سے آخرت تک وسیع اور اس کے بعد بھی جاری ہے، اس کی تقدیر قادرِ مطلق کی بنائی ہوئی ہے جس کی تخلیق کی ہوئی فطرت میں نہ کوئی فتور ہے نہ کوئی قصور۔

اب دیکھیے کہ جو تصور ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے ترانۂ ہندی کا ہے وہی ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کے ترانۂ ملی کا ہے، اس لئے کہ جب ''چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا'' ہے تو پھر فرق و امتیاز کیسا؟ سارا جہاں تو ہر حال میں ہمارا ہے، گرچہ یہ ممکن ہے کہ پہلے اور دوسرے ترانے کے درمیان ایک ذہنی ارتقا کا سراغ لگایا جائے، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلا مرحلہ دوسرے مرحلے کے خلاف ہے یا دوسرا پہلے کی نفی کرتا ہے۔ شاعر تو اس حد تک وطن اور ملت کو ہم آہنگ کرتا ہے کہ ''میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے۔ میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے'' ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' ۔۔۔۔ بانگِ درا) درحقیقت جو پیغام ''تصویرِ درد'' کا ہے وہی ''شمع اور شاعر'' کا بھی ہے دردِ انسانیت دونوں میں مشترک ہے، خواہ اس اشتراک کی جہت جو بھی ہو۔ بہر حال، وطن اور ملت کی باتیں جس وسیع تناظر میں کی گئی ہیں اس کی جھلک ہم ''شعاعِ امید'' میں دیکھ چکے ہیں، جس کے مطابق مشرق کے مرکز سے مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب میں بھی اُجالا پھیلانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے، معاملہ وہی دردِ انسانیت کا ہے، ملک ہو، مشرق ہو، مغرب ہو، سب ایک

ہی منزل کے مراحل اور ایک ہی سفر کے سنگ ہائے میل ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ، ایک دوسرے سے وابستہ اور باہم مدد و معاون ہیں۔

اقبالؔ کے افکار کی اس ہم آہنگی کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں تخلیق کی ہوئی ان کی نظموں کے خیالات ایک ربطِ باہمی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اعادہ متنوع اسالیب سے مختلف مواقع پر ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ طویل نظموں کے متعدد اجزا کے مفاہیم ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کو الگ الگ کر کے سمجھنے کی کوشش عبث ہے۔ مثال کے طور پر ''خضرِ راہ'' کے ''جواب خضر'' میں ''صحرا نوردی''، ''زندگی''، ''سلطنت''، ''سرمایہ و محنت'' اور ''دنیائے اسلام'' کے سوالات پر جو کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے وہ ایک وحدتِ فکر کا عکاس ہے۔ ''سرمایہ و محنت'' کے زیرِ عنوان مزدور کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

''دنیائے اسلام'' کے زیرِ عنوان مسلمان کو خطاب کر کے کہا گیا ہے:

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اس اندازِ گفتگو سے ظاہر ہے کہ مسلمان اور مزدور کے تصورات ایک ہو گئے ہیں، جو بات ایک کے لئے صحیح ہے وہی دوسروں کے لئے، اور دونوں کے لئے بہتر مستقبل کی خوشخبری ہے، جب کہ ان کے مقابلے میں منکرین اور سرمایہ داروں کو تنبیہہ کی گئی ہے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

لہٰذا نظم کے خاتمے پر یہ پیامِ امید مسلمانوں کے ذریعے دنیا کے تمام محروموں، کمزوروں اور مظلوموں کو دیا جا رہا ہے:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المعیاد دار

یہ عصری احساس کی آفاقی جہت ہے۔

اسی طرح اقبالؔ کی تین اہم ترین نظموں کے موضوعات و احساسات

ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ''مسجد قرطبہ'' کے نکاتِ فکر ہیں زمانہ، عشق، فن، مسجد، مومن، اسلام، فطرت، مستقبل۔ ''ذوق وشوق'' کے نکات فطرت، عشق، تلاشِ حق، خدا اور فراق ہیں۔ ''ساقی نامہ'' میں فطرت، عصرِ حاضر، مشرق ومغرب، ملتِ اسلامیہ، ذاتِ شاعر، زندگی، حرکت اور خودی کے بیانات ہیں۔ یہ سب نکات و بیانات ملتے جلتے ہیں، ایک ایک نظم کے اندر بھی اور تمام نظمیں ملا کر بھی۔ یہ ترکیب اضداد نہیں ہے، ایک ہی کل کے اجزا کا ارتباط ہے، اقبالؔ کے نظریۂ خودی کے عناصر کا ظہور ترتیب ہے۔ خود نظریہ خودی کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں فرد و جماعت، آزادی و ذمہ داری، نفس و آفاق، اطاعت و اختیار، تقدیر و تدبیر، فکر و عمل، قدیم و جدید، دین و دنیا، جلال و جمال، عقل و عشق، نزاکت و صلابت کا توازن اور سب سے بڑھ کر خدا و بندہ کا تعاون نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان کی خودی، انسان کی خودی، ملک کی خودی، دنیا کی خودی، کائنات کی خودی، سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ان کے درمیان کش مکش نہیں، کشش کا اصول **کارفرما** ہے، مخالفت کے بجائے موافقت عیاں ہے اور تصادم کے **بجائے تعاون رونما**۔ بیسویں صدی کے علوم وفنون کی ترقیات اور جنگ **وامن کے اقدامات** کی ساری پیچیدگیوں اور آویزشوں میں وحدت کی یہ تلاش ایک **نہایت** مرکب، جامع اور تعمیری ذہن کا پتا دیتی ہے، پھر اس تلاش کی کامیابی اس ذہن کی عظمت کا ثبوت ہے۔ اس عظمت کا راز توحید کا تصور ہے،

جس کی بنیاد پر اقبالؔ کا نظریۂ خودی ایک استواری اور ہمواری کے ساتھ بلا امتیاز تمام انسانوں کو ارتقا کی اگلی منزلوں کا پیام دیتا ہے:

ہر لحظ یا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے فرحلۂ شوق نہ ہوطے
(''شاعر''۔۔۔ضربِ کلیم)

یقیناً توحید کا خالص و کامل تصور صرف اسلام میں موجود ہے۔ اسی لئے اقبالؔ کا نظریۂ خودی اسلام کے نظریہ حیات سے ماخوذ اور ان کا نظامِ فکر اسلام کے نظام زندگی پر منحصر ہے۔ یہ اسلام بہر حال ایک آفاقی اصول ہے، جس کے کمالات کا اعتراف اسلام کا سب سے بڑا حریف ''ابلیس'' اس طرح کرتا ہے کہ تقاضائے وقت اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا پتا دیتا ہے:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نَے کوئی فغفور و خاقاں، نَے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز)

یہ دین فطرت نعمتِ خداوندی اور مذہب انسانیت ہے۔

اقبالؔ نے جس انداز سے عصرِ حاضر کے سامنے نظریۂ خودی پیش کیا وہ انہیں اپنے دور کے تمام مفکّرین و قائدین سے ممتاز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کی نئی نسل سب سے زیادہ اقبالؔ ہی کے افکار سے متاثر ہوئی، جب کہ مغرب میں بھی ان کے متعلق تجسّس پایا جاتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے کہ کسی شاعر نے معاشرے کی تشکیلِ جدید کے لئے کوئی معیّن نصب العیّن تجویز کیا ہو اور اسے عوام و خواص دونوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا ہو۔ اس واقعے کے رونما پذیر ہونے میں اقبالؔ کی علمیت و شخصیت دونوں کا دخل ہے، وہ ماہرِ فن ہونے کے ساتھ ساتھ خونِ جگر اور آہِ سحر کا سوز و گداز بھی رکھتے تھے

اور اظہارِ خیال کے علاوہ عملی جدوجہد بھی کرتے تھے۔ ان سب اداؤں نے مل کر اقبالؔ کو اس خودی کا ایک نمونہ بنا دیا جس کے وہ علم بردار تھے۔ ایک طرف مشرق و مغرب کے قدیم و جدید علوم و فنون کی جامعیت اور دوسری طرف زمانۂ حاضر کے مسائل کی بصیرت نے تعلیم یافتہ افراد میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ اقبالؔ کے مشورے حقیقت پسندانہ اور مفید ہیں۔ چنانچہ جب نوجوان اپنے مذہب سے برگشتہ اور معاشرے سے بیگانہ ہونے لگے تھے اس وقت اقبالؔ کی آواز نے ان کے اندر ایک دینی روح پھونکی اور انہیں اپنے معاشرے سے وابستہ رکھا۔ دورِ جدید میں طلوعِ اسلام کا اعلان سب سے پہلے اقبالؔ نے کیا، مشرق کی نشاۃِ ثانیہ کا اوّلین مژدہ بھی انہوں نے ہی سنایا اور انسانیت کی تعمیرِ نو کی بشارت بھی انہوں نے سب سے آگے بڑھ کر دی، حالانکہ اسلام کے زوال کا ماتم ہونے لگا تھا، مشرق کے انحطاط کا نوحہ پڑھا جا رہا تھا اور انسانیت کی تباہی کا نظارہ دیکھا جا رہا تھا۔

اقبالؔ کے عمل کا محاذ مشرق تھا اور ان کی فکر کا اُفق پورا عالم۔ وہ آج کی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کے آغاز کے لئے مشرق کی سرزمین کو موزوں ترین تصور کرتے تھے اور اس کی تکمیل کی آرزو پوری انسانیت کی سطح پر کرتے تھے۔ وہ ایک بین الاقوامی دور کے دانش ور اور فنکار تھے۔ لہٰذا وہ تاریخ کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے شاعر تھے جس نے شعوری طور پر آفاقیت کو اپنا مطمعِ نظر بنایا۔ ان کا نظریۂ خودی بھی کائناتی تھا۔ ان ہی معنوں میں اقبالؔ بیک وقت اور یکساں

طور پر شاعرِ مشرق اور شاعرِ انسانیت دونوں تھے۔ اقبالؔ کے کمالات وفتوحات کی جڑیں ہندوستان، مشرق اور ملتِ اسلامیہ میں پیوست ہیں، جب کہ شاخیں دنیا اور آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا بیج اسلام نے بویا اور پھل نوعِ انسانی کی مشترک میراث ہے:

نکلی تو لبِ اقبالؔ سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا؟
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی ، دل محفل کا تڑپا بھی گئی!
(غزل۔۔۔۔بانگِ درا)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

اسماءُالرِ جالِ اقبالؔ

علامہ اقبالؔ کی درگاہ زیارت گہہ خاص و عام تھی۔ وہاں ہر کسی کو آنے کی اجازت تھی اور حضرت علامہ ہر ایک سے ہر طرح کی بات کرتے تھے جیسے انہوں نے فرمایا ہے:

ہست ایں مے کدہ ودعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اب جو انہیں اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے تو جو کوئی ان سے کبھی ملا وہ اپنے ظرف کے مطابق ان کے متعلق باتیں سُنا کر اپنے لیے بقائے دوام حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ بجا ہے کہ اتنے بڑے آدمی کی جو بات بھی کسی کو یاد ہو اسے نقل کرنا فائدے سے خالی نہیں۔ مگر جس طرح وضعی حدیثیں موجود ہیں، اور بعض خوش نیتی سے غلط نقل ہو گئی ہیں، یہی اقوالِ اقبالؔ کی حالت ہے (مجھے سب سے زیادہ تعجب

ان خطوں پر ہے جو ایک حیدر آبادی لمعہ صاحب کے نام سے ''خطوطِ اقبالؔ'' کے مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔ مولّف نے اصل خطوط نہیں دیکھے، حیدر آبادی صاحب نے خود ہی نقل کر کے بھیج دیے اور اسی طرح شائع کر دیے گئے۔ میری رائے میں یہ خط بیشتر وضعی ہیں۔ عبارت پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ مثلاً ''استفادہ حاصل کرنا'' یہ اقبالؔ کا لفظ نہیں، مولف شیخ عطاؔ اللہ نے تفحص سے کام نہیں لیا)۔

اقبالؔ کے ملنے والوں کی کئی اقسام ہیں:

ایک تو ان کے رشتہ دار تھے۔ ان میں ان کے بڑے بھائی بجائے والد تھے ان سے علمی تعلقات نہ تھے۔ ان کے بھتیجے اعجاز اُن کے عزیز تھے اور ان کے قادیانی ہونے کے باوجود علامہ نے انہیں بچوں کا گارڈین مقرر کیا۔

سیالکوٹ ہیں ان کے اُستاد مولوی میر حسن مرحوم تھے۔ وہ اقبالؔ کے نہیں بلکہ اقبالؔ ان کے ملنے والے تھے۔ اور جب بھی آپ اپنے وطن مالوف سیالکوٹ جاتے، مولوی میر حسن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس طرح جس طرح شاگردی کے زمانے میں جاتے تھے۔ دھسہ لپیٹ کر، سلیپر پہن کر ان کے سامنے چٹائی پر بیٹھ جاتے اور علمی مشکلات حل کراتے۔ مولوی ظفر اقبالؔ ملاقاتوں کے شاہد ہیں۔

کچھ ان کے ہم عمر یا برابر کے احباب تھے ان میں نواب ذوالفقار علی خان کا خاص مقام تھا۔ ان کا گھر ان چند گھروں میں سے تھا۔ جہاں اقبالؔ خود

جاتے تھے۔ ایک اور بُزرگ میاں نظام الدین مرحوم کا گھر تھا، جہاں اقبالؔ التزام کے ساتھ سال میں ایک دو مرتبہ ضرور جاتے تھے۔

ابتدائی دوستوں میں مولوی امیر الدین وکیل فقیروں کا خاندان اور بھاٹی دروازے کے چند ایک اور ہم صحبت وکیل تھے مولوی احمد الدین مرحوم نے حضرت علاّمہ کے سوانح حیات لکھے۔ جس طرح نواب ذوالفقار علی خاں کی کتاب اقبالؔ کی شاعر ہے۔ مولوی احمد الدین کی سوانح عمری سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔ بھاٹی دروازے کے دوستوں میں سید بشیر کا خاص مقام تھا۔

''ابر گوہر بار کی اصل علّت'' کے تذکرے میں علامہ نے ان کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔

ابتدائی دور کے ''ہم ادب'' ساتھی سر عبدالقادر، میر غلام بھیک نیرنگ اور میر اعجاز حسین تھے۔ بعد میں خوشی محمد ناظر اور مُنشی سراج الدین کشمیر والے بے تکلّف ادبی دوست بنے۔ منشی سراج الدین کو حضرتِ علامہ ''بزمِ ادب'' کہا کرتے تھے اور اُن کے ادبی ذوق کے بہت قائل تھے۔

اس دور میں ایک صاحب ملک حبیب جالندھری تھے، جن کے صاحبزادے حسیب صاحب ریڈیو اور فلم میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ میر غلام بھیک نیرنگ کی مشہور غزل میں انہی کی طرف اشارہ ہے۔ وہ جس کا ایک شعر ہے۔

اے وائے نامردی دشتِ جنون شوق
اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے

ایک خاص مقام میاں فیملی کا بھی ہے۔ شاہ دین ہمایوں کا ادبی ذوق اور میاں شاہ نواز مرحوم کی دوستداری اور محبت نے اقبالؔ سے پیوستگی حاصل۔
سر محمد شفیع اور میاں فضل حسین سے بھی ابتداء میں گہرے تعلقات تھے لیکن دنیوی اور سیاسی حالات نے ہم چشمی کو چشمک بنا دیا۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے میاں فضل حسین مرحوم سے میں نے کہا کہ علامہ اقبالؔ کے اردگرد کے لوگ کچھ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ غلط فہمی زیادہ ہو رہی ہے، آپ علامہ سے مل کر معاملہ صاف کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی مزاج پرسی کو جانے کے لیے جی بہت چاہتا ہے۔ لیکن ایک دو سیاسی امور صاف ہو جائیں تو جاؤں گا۔ اس سلسلے میں بعض بہت دلچسپ باتیں ہوتیں۔ یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ اس وقت یہ دونوں پرانے دوست مرضُ الموت میں مبتلا تھے۔ ایک دو سال میں یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔

سر عبدالقادر سے بھی ''غلط فہمی'' ہو گئی تھی۔ لیکن وضعداری قایم رہی۔ چودھری سر شہاب الدین سے بڑی بے تکلفی تھی اور ان کے عزیز دولتانہ مرحوم کی رنگین محفلوں میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔

غیر مسلموں میں امراؤ سنگھ سے، جو سندر سنگھ مجیٹھیہ کے بھائی تھے اور امرت شیر گل کے باپ تھے۔ بڑی یاری تھی۔ سردار سنگھ سے بھی بڑی بے تکلفی تھی۔ اس حلقے کے ایک دو اور سردار صاحبان بھی تھے جن سے تعلقات تھے۔ ابتدائی دور میں سوامی تیرتھ رام سے دوستی تھی۔

اسی طرح شیونرائن شمیم سے بھی بے تکلفی تھی اور وکیلوں کے حلقے میں سب سے زیادہ بے تکلف پیر تاج الدین تھے جو اِس وقت بھی اسی طرح زندہ دل ہیں، جیسے ان دنوں تھے۔

ملک برکت علی سے لیگی تعلقات تھے۔ غلام رسول بیرسٹر سے بہت گاڑھی چھنتی تھی، اور خلیفہ شجاع الدین سے انجمن حمایت اسلام کی وجہ سے بھی تعلقات تھے۔ حاجی شمس الدین صاحب مرحوم انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کا حضرت علامہ بہت احترام کرتے تھے۔

مرزا جلال الدین بیرسٹر سے وکیلی تعلقات کا سلسلہ رندانہ دوستی کی حد تک پہنچ گیا۔ اقبالؔ کی ''رندی'' کوئی راز نہیں لیکن رندی بیشتر لفظی اور خیالی رندی تھی۔ جوانی کا زور تھا اور بس۔ اقبالؔ پر رندی کبھی غالب نہیں آئی۔ رندی پر اقبالؔ ہی غالب رہا ہے۔ میں اس وثوق سے اس لیے کہتا ہُوں کہ اقبالؔ نے کبھی اپنی پردہ پوشی نہیں کی۔ ہم نے جو سوال کیا اس کا صاف جواب دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زندگی میں کوئی چھپانے کے قابل بات ہی نہیں تھی اور جسے

رندی کہا جاسکتا ہے وہ سب ''اسرارِخودی'' سے پہلے کے لطائف ہیں۔ ان لطائف کوسر شادی لال نے اقبالؔ کو ہائی کورٹ کی ججی سے روکنے کے لیے اور چندان کے ہم پیشہ مسلمان مشاہیر نے اپنے مطالب کی خاطر خوب بڑھا چڑھا کر شہرت دی۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

میں اقبالؔ کو ولی نہیں کہتا، لیکن ایسا تہجّد خواں، عاشق رسول، اولیاء کا خادم اور عقیدت گزار خوش عقیدہ گداز قلب مسلمان انگریزی دانوں میں کم دیکھا ہے۔ مگر مزاج میں رندی موجُود تھی۔ اچھی شکل کو اچھی شکل ضرور سمجھتے تھے۔ لیکن عاشقی کے گناہ گار کبھی نہیں ہُوئے۔ عمل میں توازُن تھا، طبیعت میں شاعری۔ آخری دور میں راس مسعود سے بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ برادرانہ قسم کی بے تکلفی اور محبت کے تعلقات۔

یہ تو تھے ان کے برابر کے احباب۔ اب آتے ہیں ان کے نیاز مند! ان سب میں مقام اوّل چودھری محمد حسین صاحب کو ہے، چودھری صاحب نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں ملازم تھے۔ اس طرح علامہ اقبالؔ سے تعارف ہُوا اور ان کی دیانت داری کی جو عزّت نواب صاحب کے ہاں تھی، اس کی وجہ سے اور اپنے خلوص اور خدمت گزاری اور اسلام دوستی کی وجہ سے علامہ اقبال کے آخری دور میں جو قرب انھیں حاصل ہُوا اور کسی کو حاصل نہ ہُوا۔ چودھری صاحب نے اقبالؔ کی ذات سے جو وفاداری کی ان کی زندگی میں ہی کیا وہی اسلوب ان کی

وفات کے بعد ان کی اولاد سے قایم رکھا۔ اس قدر خدمت گزاری کی، اس قدر دیانت داری سے امانتداری کی، اِس طرح زندگی کو وقف کر دیا کہ اس کی مثال ملنی محال ہے۔

بعض لوگ چودھری صاحب کی حفاظت داری کے غلو سے شاکی ہیں لیکن اس معاملے میں غفلت سے غلو بہتر ہے۔ کچھ لوگ ان کی ''اجارہ داری'' سے جلتے ہیں۔ لیکن یہ رُتبہ چودھری صاحب نے اپنے عمل سے حاصل کیا باتوں سے نہیں نیازمند تر باتوں کے نیازمند تھے۔ چودھری محمد حُسین باعمل نیازمند تھے۔ علامہ اقبالؔ انھیں محض دوست اور مخلص مسلمان سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ چودھری صاحب ایک خاص کینڈے کے شخص ہیں ''محاوری'' کا غلو ان میں موجود ہے۔ لیکن اس غلُو اقبالؔ کی اولاد کے حقوق کی اس طرح حفاظت ہُوئی ہے کہ کسی اور طرح ممکن نہ ہوتی۔

چودھری محمد حسین نے اپنی زندگی اس کام میں صرف کر دی یہ بات برملا کہنے کی ہے۔ مگر کم لوگ اسے کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اقبالؔ کے نیازمندوں میں ایک طرح کی رقابت سی پائی جاتی ہے کہ یہ عاشقوں کی پرانی ہے ریت! چودھری صاحب کو اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کیا۔

چودھری صاحب اقبالؔ کے جسمانی محافظ تھے۔ اقبالؔ کا روحانی محافظ کوئی نہیں تھا۔ جو شخص اقبالؔ سے ملتا تھا وہ اپنے ظرف کے مطابق اپنے جام کے

مطابق متمتع ہوتا تھا۔ ''اسرارِ خودی'' کے بعد اقبال کی شاعرانہ شخصیت پوری طرح پختہ ہوگئی پیامِ مشرق کا اقبالؔ ایک نادرالمثال اقبالؔ تھا جو اپنے آپ میں مکمل تھا۔

اس آخری دور میں جو نئے لوگ باقاعدہ آتے تھے ان میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا نام سب سے پہلے آتا ہے چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی خوش مزاجی حضرت علامہ کی بے تکلفی کے لیے مہمیز کا کام دیتی تھی۔ وہ فقرے ہوتے تھے کہ باید وشاید!

ایک باب ''اطعمہ'' کا تھا جس کا خلاصہ اس مضمون میں دیا جاتا ہے جو'' اکال الکل'' کے عنوان سے ''مخزن'' کے۔۔۔ میں شائع ہُوا۔ میں نے محض رپورٹ لکھی ہے، فقرے میرے نہیں۔ جو صاحب علامہ اقبالؔ کی پھبتیوں کی مثالیں چاہتے ہیں وہ اس مضمون دیکھ لیں۔ ڈاکٹر عبداللہ کے بڑے بھائی عبدالرحمٰن چغتائی اور 'نیرنگ خیال' والے یوسف حسن بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

ایک دور سالکؔ و مہرؔ کا تھا اور یہ نہایت گرم دور تھا۔ سیاست دورزی نے مہرؔ صاحب کو الگ کر دیا۔ لیکن سالک اپنے مقام پر قایم رہا۔ گرامیؔ اور اقبالؔ جمع ہوتے تو ان میں سالکؔ ہی سجتا تھا۔ سالکؔ کہاں نہیں سجتا!

میں نے مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبالؔ کو بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھا ہے لیکن وہ دو بجے رات کی محفلیں کچھ اور تھیں سالک شریک ہوتا تھا، اشعار

پڑھے جاتے تھے، مسلسل پڑھے جاتے تھے اور سالک کے حافظے پر حیرت ہوتی تھی۔

ایک حلقہ پروفیسروں کا تھا۔ ان میں ڈاکٹر معیاالله، پروفیسر حمید احمد خاں اور پروفیسر عبدالحمید تینوں اسلامیہ کالج کے تھے۔ ان سے پہلے ڈاکٹر ملک نزیر احمد اور ڈاکٹر مظفر قریشی کی آمد و رفت تھی۔ یہ بھی اسلامیہ کالج کے تھے۔ مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر اقبال اورینٹل کالج والے پرانے ملنے والے تھے اور شیرانی مرحوم تو مرید باصفا تھے۔

حیدرآباد جانے سے پہلے خلیفہ عبدالحکیم سے بھی اسی طرح کی پروفیسرانہ علمی، کتابی، شعری باتیں ہوتی تھیں اسلامیہ کالج کے پروفیسر حاضر باش تھے اور علامہ کو ان سے خاص اُنس تھا، اسلامیہ کالج سے خاص انس تھا۔ ابتدائی دور میں مرزا سعید سے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر آرنلڈ ان کے بھی استاد تھے۔

خاص لاہور کے شہریوں میں ملک لال دین قیصر کا ایک الگ مقام تھا۔ خالص پنجابی میں کھری کھری صاف بات سخت بے تکلفی سے کہتے اور اپنے بے مثل خلوص کی وجہ سے جو کہتے اس پر توجہ ہوتی۔

مجھے وہ الیکشن کا جلوس یاد ہے جس میں قیصر کے پنجابی شعر گائے جاتے تھے اور علامہ سرلشکر تھے۔ پھولوں کے ہار پہنے ہوتے، شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل جا رہے تھے اور فقرے پر فقرہ ہو رہا تھا۔ پنجابی کے

مصرعے موزون ہوتے جاتے تھے۔ الیکشن کے دوران میں مجھے پبلسٹی اور دفتر کا کام دیا گیا۔ شہر کے لوگ اقبالؔ سے والہانہ ملتے تھے، علامہ مرحوم ہر ایک سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔

ایک حلقہ راجہ حسن اختر، میاں محمد شفیع اور سید نذیر نیازی کا تھا۔ یہ حضرت علامہ کی وفات کے قریب کا وقت ہے۔ راجہ صاحب اور میاں صاحب بڑے کام کے آدمی تھے، بھاگ دوڑ کرنے والے تھے، بالخصوص میاں محمد شفیع صاحب کہ اُن کی عقیدت مندی عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

سید نذیر نیازی کتابی شخص، ایک سیالکوٹی، پھر مولوی میر حسن کے قرابت دار، طبیعت کے رند، اسلامیات میں اور جامع ملیہ سے لگاؤ بی اور لاگ بھی۔ ایسا مجتمع اضداد شخص اقبالؔ کے ڈھب کا تھا۔ بات کرنے میں کچھ مزا آتا ہوتا، چنانچہ اُن کا حضرت علامہ کے فلسفیانہ لیکچروں ک ترجمہ اسی دور کی یادگار ہے۔

سید نذیر نیازی اور چودھری محمد حسین اگر اکٹھے بیٹھ جائیں اور مجھے اجازت ہو کہ میں روئداد لکھوں تو ملفوظات کا دفتر مرتب ہوسکتا ہے جس سے انسانی نفسیات کے تجزیے کے لیے نہایت دلچسب مواد مل سکتا ہے۔ بہر صورت قربت پہلا کا پہلا مقام چودھری محمد حسین ہی کو حاصل رہتا ہے۔ ہوالاوّل ہوالآخر!!

ملنے والوں کے اس متن کے بہت سے حواشی ہیں۔ ایک حاشیہ ۵۶ فی

صدی تحریک کا اور ایک غازی علم الدین کمیٹی کا ہے علامہ اقبالؔ دونوں کے روح رواں تھے۔ میں اس دنوں کمیٹیوں میں تھا۔ اس کے بہت تھوڑے ممبر تھے۔ ان میں سے ایک لال دین قیصر اور ایک مصطفیٰ حیرتؔ تھے۔ حیرتؔ نے بعد میں ایک مختصر سا رسالہ نکالا۔ جس میں اور فقط اس میں علامہ اقبالؔ کا غیر مطبوعہ اُردو کالم التزام سے شائع ہوا۔ ساقی نامے کے شعر اول اول اسی میں شائع ہُوئے۔

کشمیر کمیٹی کی تحریک میں حاجی رحیم بخش سے رابطہ استوار ہوا اور آخر عمر تک قایم رہا۔ میں اس کمیٹی کی روئداد لکھا کرتا تھا امامِ جماعت قادیان سے تعلقات بگڑنے کے مراحل بغور دیکھے۔

مسلم آؤٹ لک کے وقت سے برادرم مجید ملک کی آمد و رفت پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ان کے والد ملک محمد دین مرحوم علامہ کے محبّانِ خاص میں سے تھے اور جب یہ دو بزرگ صوفیائے کرام کی کرامتوں کا ذکر کرتے تھے تو گھنٹوں اس کے علاوہ کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ میں ذرا گستاخ تھا۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر دونوں بزرگ میری جوانی کو میری خامی کی وجہ قرار دیتے اور ایک بار اس خامی کو دور کرنے کے لیے حضرت علامہ مجھے ایک پیر صاحب کے پاس لے گئے۔ ان پیر صاحب کا سرہند شریف سیت تعلق تھا۔ اقبالؔ پیروں فقیروں کے ملنے والوں میں سے تھے اور پیر فقیران سے ملتے تھے۔ یہ ایک اور حاشیہ تھا۔

لیگی دور میں عاشق بٹالوی آتے ہیں۔اسی طرح اور کئی نام ہیں۔ وہ تو ایک چشمۂ شیریں تھا۔ مورو ملخ کا قافلہ آتا جاتا رہتا تھا۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ میں نے فقط ان لوگوں کا نام میرے علم میں مداومت سے آتے تھے اور جن سے میں واقف ہُوں۔ زائرین کا ذکر نہیں کر رہا، ان کی تعداد بے شمار ہے سُلیمان ندوی جیسے بزرگ سے لے کر سیدین تک لاہور آتے اور مل کر جاتے۔ مولانا محمد علی کا نائب ہو کر آنا ایک الگ باب ہے۔

ہمعصر شعرائیں گرامی ان کے سب سے بڑے رفیق تھے۔ اقبالؔ انہیں ''فنافی الشعر'' کہا کرتے تھے اور ان سے یاری تھی۔ اکبرالہٰ آبادی سے علامہ کو بڑی عقیدت تھی۔ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سے دیر خط و کتابت رہی۔ ان کی شاعری کے قائل تھے۔ ایک دن اصغر گونڈوی مجھے لے کر علامہ اقبالؔ کی خدمت میں پہنچے۔ اس سے اصغر صاحب نے اپنا کلام نقل کروا کر مجھے علی گڈھ سے بھجوایا اور چاہا کہ میں علامہ اقبالؔ سے اس کے متعلق رائے طلب کروں ملازمت کے سلسلے میں لاہور آ گئے اور علامہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حضرت علامہ سے کہا کہ اپنی رائے لکھ دیجئے۔ علامہ نے فرمایا کہ تاثیر صاحب جو لکھ دیں میں اس پر دستخط کروں گا۔ یہ ان کا انداز خاص تھا۔ مدعا یہ تھا کہ ڈرافٹ کو لکھ دے وہ کاٹ چھانٹ کر دستخط کر دیں گئے اور جب وہ یہ کہتے تھے

کہ رائے دینے سے باک نہ ہو۔ مگر اصغر گونڈوی صاحب تھے۔ انہیں غلط فہمی ہوگئی۔ سمجھے کہ علامہ اقبالؔ نے ان کے کلام کو ذاتی توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ یہ ایک طرح درست بھی تھا اقبالؔ اصغر کو اچھا مشاق خوش گو سمجھتے اور بس۔۔۔۔ اور اصغر تھے بھی یہی۔ مگر ان دنوں رشید صؔ یقی اور علی گڑھ بہت اچھال رہے تھے۔ اس لیے غالباً اصغر ذرا زیادہ حساس ہو گئے تھے مگر اصغر کی خودداری کا یہ پہلو مجھے بہت پسند آیا انہوں نے دوبارہ رائے طلب نہ کی۔

شعر وسخن کا ذکر آیا تو صوفی تبسم کا نام لینا ضروری ہو گیا۔ ان کی آمد و رفت بکثرت تھی اور علامہ اقبالؔ انھیں محاورے اور زبان کا استاد بھی سمجھتے تھے اور سندات کے سلسلہ میں انھیں کئی ارشادات کیا کرتے اصل بات یہ ہے کہ اقبالؔ سے ملنے والے جب اقبالؔ کا ذکر کرتے ہیں تو اقبالؔ سے زیادہ اپنی شخصیت کو افشا کرتے ہیں۔ وہی انتخابِ

شعر کا معاملہ کہ:

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس سے اپنے دل کا معاملہ کھلتا ہے۔

اصل اقبالؔ سے ملنا ہو تو اقبالؔ کا کلام دیکھو۔ جو اقبالؔ کا کلام پڑھتا ہے، وہ اقبالؔ کا ملنے والا ہے! ''پیامِ مشرق'' اور ''بالِ جبریل'' بالخصوص زندہ

اقبالؔ ہے!

بقدر جام یہاں اذن عام ہے سب کو

(دو ضروری نام رہ گئے ہیں۔ کئی نام رہ گئے ہوں گے، لیکن یہ دو نام بہت ضروری ہیں۔ ایک منشی طاہر دین جو تمام عمر آپ کے منشی رہے، اور پھر بچوں کے گارڈین مقرر ہوئے اور دوسرا ان کا ذاتی ملازم علی بخش کہ اس نے زندگی سے زیادہ وفا کی!)

پروفیسر محمد منوّر

علامّہ اقبالؔ ۔۔۔اِجتہاد اور ختمِ نبوت

ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں کہ ''اقبال کے عقیدے کے مطابق اسلام کا تصور حیات جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔'' ظاہر ہے کہ اسلام دین حیات ہے، اور حیات ہر دم متحرک ہے، جمود میں موت مضمر ہے۔ بانگ درا کی نظم ہے ''چاند اور تارے'' مختصر سی نظم ہے۔

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا، چلنا، مدام چلنا

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر، سب
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن!

''پوشیدہ قرار میں اجل ہے'' یہ مضمون گویا کلام اقبالؔ کی روح ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ نظم ''چاند اور تارے'' بانگ درا کے حصہ دوم سے تعلق رکھتی

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 – 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے ۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے با آسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک:

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ یہ نظم ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے مابین لکھی گئی اور اس وقت حضرت علامہ اقبالؔ کی عمر تقریباً تیس برس تھی۔ ہاں مگر یہ تھی شعر کی بات، نثر میں وہ اس مضمون کو ۱۹۰۴ء میں ہدف توجہ بنا چکے تھے اور اس طرح کہ انہوں نے ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا ''قومی زندگی'' اور جو اسی سال ''مخزن'' میں چھپا' اور اب ''مقالات اقبالؔ'' کی زینت ہے۔ اس مقالے کے کلمات ذیل ملاحظہ ہوں:

> ''جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے' اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے' بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے' اسلامی دنیا میں اب تک کوئی ایسا عالی دماغ مقنن پیدا نہیں ہوا' اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔''

علامہ اقبالؔ نے نظم ''چاند اور تارے'' کے آخری شعر میں اس حرکت کونی کے محرک کی طرف بڑی نفاست کے ساتھ مفکرانہ اور شاعرانہ انداز میں اشارہ کر دیا ہے۔

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق انتہا حسن!

یہ کائناتی حرکت جس کا آغاز عشق اور انتہا حسن ہے، جب قصر تخلیق کے سب سے اہم مہمان یعنی آدم سے منسوب ہو تو علامہ اقبالؔ کی نظروں میں اس تخلیق کاری کا نقش بے قرار کچھ اس طرح کا قرار پاتا ہے۔

در طلبش دل تپید، دیر و حرم آفرید!
ما بہ تمنائے اوٗ او بہ تماشائے ماست

دل نے محبوب ازل یا روح نے محبت کی کشش ثقل کے نقطۂ مطلق کی طرف بے تابانہ سفر شروع کیا۔ دل نے اس بے تابی کو قدرے تسکین یاب کرنے کے لئے عارضی سہارے اختراع کئے اور قبول فرمائے۔ کبھی حرم کا سہارا لیا، کبھی دیر کا، بت گھڑے، تماثیل بنائیں، سجدے کئے۔ یہ سجدے بت محسوس کے لئے بھی

تھے اور خدائے نامحسوس کے لئے بھی۔ بندے کی طرف سے یہ سب کچھ اشتیاق کا مظہر تھا' اور مصدر و مال روح یعنی محبوب مطلق' عشاق کی ان گونا گوں کوششوں کا نظارہ کرتا رہا' دیکھتا رہا کہ بندہ کیا کر رہا ہے' کہاں جا رہا ہے' رک تو نہیں گیا' باطل سہاروں کو حقیقی سہارا تو نہیں جان لیا' پھر سفر روحانی میں رکاوٹ بننے والے سہاروں کو ختم کرنے اور تلاش و جستجو کے ذوق کو بالیدہ اور مصفا کر کے نیا ولولہ شوق دینے کی خاطر مرحلہ بہ مرحلہ نیا پیغام اور نیا پیغام بر عطا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پیغام بھی رفتہ رفتہ اپنے کمال کو پہنچا اور پیغام بر کا مقام بھی۔

ہر پیغمبر کے پیغام کی عملی روح کا نام اسلام تھا۔ یہ پیغام مکمل ہوا تو قرآن حکیم کہلایا۔ پیغامبر اتمام پذیر ہوا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ پھر کسی مزید رسالت یا پیغام ہدایت کو نہیں آنا تھا۔ کسی رسول یا پیغمبر کو تشریف نہیں لانا تھا۔ چونکہ قرآن ایک جاودانی ارشاد ہے، لہذا وہ سراسر حرکت و عمل کا درس ہے۔ مگر حرکت خیر اور عمل خیر! اسی طرح قرآن حکیم میں مندرج آیات الٰہی کے مطابق جو شریعت حضور نبی اکرمؐ نے تشکیل فرمائی' وہ شریعت ہر دم حرکت پذیر ہے' وہ روح تازہ کی مالک ہے' وہ تازہ بہار معانی کی خالق ہے' اور متقاضی ہے کہ حقیقت شناس اہل ایمان قرآن کی روح کو اپنی کاہلی کے باعث کاہل نہ ہونے دیں اور شریعت کے اصول حرکت کو اپنی بے شوقی کے باعث جامد نہ ہونے دیں۔ چنانچہ علامہ اقبالؔ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا۔

باطن او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دمے

قرآن کی روح تو مستقل ہے، غیر متغیر ہے مگر تعلیم قرآن جس میں یہ روح پنہاں ہے، ہر لحظہ حرکت تازہ کا تقاضا کرتی ہے۔

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

جیسا کہ ۱۹۰۴ء والے مقالے ''قومی زندگی'' کے اقتباس سے واضح ہوا، علامہ اقبال کسی ایسے فرد یا افراد کے جو یا تھے جو اسلام کے آئین کو اپنے زمانے کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی اہلیت اور ہمت رکھتا ہو، مگر حضرت علامہ کے نزدیک علماء کرام میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ تحقیق و تدقیق سے کام لیں اور فقہاء کے وضع کردہ اصولوں کی لم اور پس منظر تک پہنچیں، یہی نہیں بلکہ وہ ''تازہ کاری'' کو بے لگامی سے محفوظ رکھنے کے لئے بطور پیش بندی، کچھ شرائط بھی عائد کریں یا قدما کی عائد کردہ شرائط میں ترمیم و اضافہ کریں۔ یہ سعی و جہد آسان نہ تھی، لہٰذا سہولت پسند علماء و فقہاء کو بھلائی اسی میں نظر آئی کہ جو کچھ اسلاف فقہاً عطا

کے سپرد ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ''میری امت کے عالم افراد انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔'' مگر شاید علماء اسلام کی بھاری اکثریت اس حدیث شریف کو ارتقاء اصول دین کی تدریج کے حوالے سے نہیں دیکھتی۔ علماء حضرات بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے ساتھ اپنی برابری کا مفہوم دہراتے رہتے ہیں' اور خوشی سے پھولتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ارشاد ہوا، دین کو ہر پیغمبر آ کے اپنے عہد کے مطابق روح تازہ سے سرشار کرتا تھا' اب وہ ''تازہ کاری'' علماء کی ذمہ داری ہے' اور علماء پر اس ذمہ داری کا آن پڑنا ختم نبوت کا ایک اہم تقاضا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے فرمایا:

> ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبرؐ کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے' آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے' لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے' لہٰذا اسلام کا ظہور' استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یوں

ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو قبول نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے' کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔''

یہ اقتباس علامہ اقبالؔ کے اپنے اس شعر کی جو ابھی اوپر درج ہوا' مختصر سی تشریح ہے۔ یہ شعر قرآن حکیم کے بارے میں ہے۔

باطن او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دمے

یعنی اسلام کی اصلی اور بنیادی ہدایت و تعلیم کو بحال و قائم رکھتے ہوئے اصول و ضوابط عمل کو یا یوں کہیے کہ فقہ کو ہر زمانے کا ساتھ دینا ہوگا۔ یہ ختم نبوت کی عطا فرمودہ ذمہ داری ہے۔ وحی کا اتمام گویا خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے آدم کے حق میں یہ اعلان ہے کہ آدم رفتہ رفتہ عقلی بلوغت کی منزل پر پہنچ گیا ہے' اب

اسے مزید اس طرح پابند نہیں رکھا جائے گا کہ وہ نئے احوال میں نئی وحی اور نئے پیغمبر کا منتظر رہے۔ آئندہ آدم کو قرآن کے بیان کردہ بنیادی احکام واصول کی روشنی میں اپنی عقل، دانش اور تحقیق وجستجو سے مدد لینا ہوگی اور نہاد و بنیاد اسلام کو قائم رکھتے ہوئے نئے نئے اصول وضع کرنے ہوں گے۔ اور نئے قواعد بنانا ہوں گے۔ کہیں نئے اسلوب تعبیر سے کام لینا ہوگا۔ کہیں ترمیم سے، کہیں تجدد اور اختراع سے۔۔۔۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے۔۔۔ حق یہ ہے کہ ختم نبوت کی توجیہات میں سے یہ ایک نہایت روشن اور حوصلہ افزا توجیہ ہے۔

جناب ممنون حسن خاں

اقبالؔ کی فیضانی یادوں کے سائے

اگر کاری درو نم راخیالِ دوست رایابی
پریشاں جلوۂ چوں ماہتاب اندر بیابانے

آل انڈیا ریڈیو بھوپال اسٹیشن کے لائق اراکین نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اپنے مرشدِ کامل، دانائے ضمیر کائنات حضرت علاّمہ اقبالؔ کی ذاتِ والا صفات کے متعلق کچھ باتیں عرض کروں۔ اپنی کچھ یادیں اُن کی نجی زندگی کے متعلق بیان کروں۔ اُن کا لباس، اُن کی خوراک، اُن کی عادات، ان کی فکرِ رسا، ان کی شگفتگی طبع اور ظرافت کے متعلق کچھ عرض کروں۔ ان تاریخی یادوں کو بیان کرنے کے لئے مجھے دس منٹ دیئے گئے ہیں۔ صرف دس منٹ۔۔۔ میری یادوں کے سائے تو بہت لمبے ہیں۔ حیران ہوں کہ اس قدر قلیل وقت میں اس طویل داستانِ عشق کو کس طرح بیان کروں۔ پھر بھی بہت مختصر طور پر جو بھی عرض کر رہا ہوں اُس کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ سماعت فرمایئے۔

حضرت علاّمہ اقبالؔ بغرض علاج جب بھی بھوپال تشریف لائے مجھے ان کی خدمتِ اقدس میں بطور ان کے ایک ادنیٰ کفش بردار اور سفتہ گوش حاضر رہنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ برقی علاج کے لئے بھوپال میں اُن کے قیام کی مدّت تقریباً ایک سو بیس دن ہوتی ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت علاّمہ کے ساتھ بہت ہی کم سامان ہوتا تھا ۔ بستر کے لئے ایک بہت معمولی دری۔ دو سفید چادریں، دو تین جوڑے کپڑے۔ تہ بند، چند بنیائن۔ ایک پنجابی کوٹ۔ ایک انگریزی سُوٹ۔ علی بخش کے پاس اُن کا پنجابی حُقّہ اور تمباکو ضرور ہوتا تھا۔

دیوانِ بیدلؔ، دیوانِ غالبؔ اور مثنوی مولانا روم کو میں نے ان کے سامان میں دیکھا تھا۔

حضرتِ علاّمہ کے مزاجِ عالی میں اس قدر سادگی کو دیکھ کر مجھے اُن ہی کا یہ شعر یاد آتا تھا۔

"راہ دشوار است ساماں کم بگیر
جہاں آزاد زی آزاد میر"

سادگی کا یہی حال اُن کے کھانے کا تھا۔ صرف دوپہر کا بہت ہی معمولی کھانا تناول فرماتے تھے۔ رات کو دلیہ دودھ کے ساتھ۔ کبھی کچھ بھی نہیں۔ اُن کی

خوراک کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔ بریانی اور سیخ کے کباب بہت مرغوب تھے جولیڈی مسعودان کے لئے بھیجا کرتی تھیں۔ غالبؔ کی طرح حضرت علامہ کو آم بہت پسند تھے۔ حضرت علاّمہ بہت کم سوتے تھے۔ بہت صبح بستر سے اُٹھ جاتے تھے۔ اُنہوں نے خود فرمایا ہے:

''نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی''

غُسل کرتے، نماز ادا کرتے اور پھر تلاوتِ قرآنِ حکیم فرماتے۔ گلے کی تکلیف کی وجہ سے وہ قرآن شریف بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ خاموشی سے مطالعہ کرتے تھے۔ اِس دوران وہ اِس قدر روتے کہ قرآن حکیم کے اوراق اُن کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔

صبح کے ناشتے میں کشمیری چائے ساتھ کے دو تین بسکٹ نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد علی بخش صاحب حُقّہ تیار کر کے پیش کرتے تھے جس سے حضرت علاّمہ دیر تک لطف اندوز ہوتے تھے۔

بھوپال میں حضرت علاّمہ کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے پرنس آف ویلز ہاسپٹل (موجودہ حمیدیہ ہاسپٹل) میں کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر سیّد عبدالباسط

اُن کے معالجِ خاص تھے۔ سر سیّد راس مسعود خود اُن کو ہاسپٹل لے جاتے تھے۔ اُن کے شخصی معاون کے طور پر میں سر سیّد ثانی کے ساتھ رہتا تھا۔ بجلی کے علاج کے دوران جب حضرت علاّمہ اپنے جوتے اُتار دیتے تھے تو میں اُن کو اپنے رُومال میں لپیٹ کر اپنی بغل میں دبا لیا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر سر سیّد ثانی بڑی محبّت سے میری طرف دیکھتے تھے اور مُسکراتے تھے۔ جب علاج ختم ہو جاتا تو میں اپنے ہاتھ سے حضرت علاّمہ کو جوتے پہنا دیتا تھا۔ مجھے زندگی میں ایسی دو سعادتیں حاصل ہوئی ہیں جن کو میں اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

اپنی مرحومہ ماں کی کفش برداری اور حضرت علاّمہ کی کفش برداری۔

ناسازیٔ مزاج کے باوجود حضرت علاّمہ کی طبیعت میں حد درجہ شگفتگی اور اعلیٰ درجے کی ظرافت تھی۔ اُن کی گفتگو بے حد نشاط افزا اور شیریں تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ ''فتادسامعہ درموجِ کوثر و تسنیم'' سیّد والا گہر سر سیّد ثانی ڈاکٹر راس مسعود خود ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ کیوں نہ ہوتے۔ آخر سر سیّد احمد خاں کے پوتے تھے۔ جو بقول خواجہ الطاف حسین حالؔی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

راس مسعود کی گُل افشائی گفتار کا جواب نہیں تھا۔ وہ حضرت علاّمہ کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے بڑے مزے کے قصّے سُنایا کرتے تھے اور حضرت علاّمہ بھی راس مسعود کے ساتھ بہت دل چسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار بہت شگفتہ مزاج میں تھے۔ راس مسعود سے ایک مذاق کا ذکر کیا۔ فرمایا:

''لاہور میں چند زندہ دل لوگوں نے ایک نیم پاگل شخص کو یہ باور کرایا کہ وہ ولی ہے۔ ایک بار یہ شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ اللہ اُس سے باتیں کرتا ہے۔ میں نے مذاق میں اُس سے کہا 'اللہ میاں کی سب باتیں نہ مان لینا'۔ پھر اُس نے کہا کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ بنے گا اور دہلی اس کی سلطنت کا پایۂ تخت ہوگا۔ میں نے اُس سے کہا کہ جناب ولی صاحب ہمارے جاوید میاں کو نہ بھول جانا اور مہر ولی کا علاقہ بطور جاگیر اُس کو عطا کر دینا۔''

سرسیّد راس مسعود بھی علی بخش سے بہت مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار اُنہوں نے علی بخش کی مونچھوں کی بہت تعریف کی۔ علاّمہ نے فرمایا:

''مسعود: تمہاری اس تعریف سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔
کم از کم تم نے علی بخش کے ساتھ انصاف کیا اور اُس کی
مونچھوں کی تعریف کی۔ میں تو علی بخش کی مونچھوں کو دیکھ کر
اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے شاعر محبوب کی زلفوں
کی تو بہت تعریف کرتے ہیں لیکن علی بخش کی مونچھوں کی
کوئی تعریف نہیں کرتا ہے۔ یہ بڑی نا انصافی کی بات
ہے۔''

میں نے حضرت علاّمہ کو فکر کرنے کی حالت میں بھی دیکھا تھا۔ ایسی حالت میں وہ اپنا سر چھپائے بہت گہری سوچ میں رہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ چہرہ بہت روشن ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے عالم میں ہیں۔ جب میں ان کی اشکبار آنکھوں کو دیکھتا تو مجھے اُن ہی کا یہ مصرع یاد آجاتا تھا۔

عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہردم باوضو رہنا

سرسیّد راس مسعود کے طفیل میں نے حضرت علاّمہ کی زبانِ مبارک سے اُن مشہورِ عالم نظموں کو بھی سُنا تھا جو اُنہوں نے دورانِ قیام بھوپال تخلیق فرمائی

تھیں۔ اس سے زیادہ مجھ ناچیز کی خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی تھی کہ اُنہوں نے چند اشعار مجھے ڈکٹیٹ کرائے تھے۔

وقت کی کمی کی وجہ سے صرف ایک فیضانی محبت کا ذکر کر رہا ہوں۔ ۴/اپریل ۱۹۳۶ء کو حضرت علاّمہ اقبالؔ نے شیش محل میں قیام فرمایا تھا۔ میں حسبِ معمول صبح کے وقت اُن کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور دست بستہ آداب بجالایا۔ فرمایا:

''آپ اچھے آگئے۔ مجھے آپ کا انتظار تھا۔ رات میں نے مسعود کے دادا سرسیّد احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ میں اپنی صحت کے متعلق بارگاہِ رسالت مآبؐ میں عرض داشت پیش کروں۔ میری آنکھ کھل گئی اور میری زبان پر یہ شعر تھا۔

یا پرستانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

میں نے اُسی وقت عرض داشت لکھنا شروع کر دیا۔ بہت سے اشعار ہوگئے ہیں'' یہ فرما کر حضرت علاّمہ نے مجھ ناچیز کو بھی بہت آہستہ آہستہ چند شعر

ڈکٹیٹ فرمائے۔ اس وقت ان کی حالت عجیب تھی جس کا بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اِس قدر روئے تھے کہ سارا چہرۂ مبارک آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ ان کی آواز تقریباً بند ہو گئی تھی۔ اللہ اللہ کیا عشقِ رسولؐ تھا۔

ایک دن حضرت علاّمہ کو بھوپال میں دردِ دل کی تکلیف ہوئی تھی۔ سید راس مسعود، ڈاکٹر سیّد عبدالباسط اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن ان کی خدمت میں حاضر تھے اور بے حد پریشان تھے۔ جب حضرت علاّمہ کی تکلیف میں زیادہ شدّت ہوئی تو اُنہوں نے ''یا اللہ'' کہہ کر بلند آواز سے یہ شعر پڑھا:

''تہنیت گوئید مستاں راکہ سنگِ محتسب
بہر دل ما آمد وایں آفت ازمینا گذشت

بعد میں جب سیّد راس مسعود نے یہ شعر پڑھا تو حضرت علاّمہ نے فرمایا:
یہ رضؔی دانش کا شعر ہے لیکن میں نے ''برسرِ ما'' کے بجائے ''بردلِ ما'' کر دیا۔ یہ تحریف میرے حسبِ حال ہے''۔

حضرت علاّمہ اقبالؔ مرزا غالبؔ کا سر سیّد راس مسعود سے اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا تھا:

''جب میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن جا رہا تھا تو خواجہ حسن نظامی کے ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار

شریف پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضری دی تھی اور اُس قبر پر بھی جس کو بتلایا گیا تھا کہ وہ مرزا غالبؔ کی ہے۔ اُس موقع پر دہلی کے ایک نہایت خوش گلو قوال ولایت خاں نے مرزا کی وہ غزل گائی تھی جس کا شعر ہے:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

علاّمہ نے فرمایا کہ اُس مجلس میں جو لطف آیا تھا وہ آج تک یاد ہے۔

اب دس منٹ ختم ہورے ہیں۔ دس منٹ میں کس کس بات کا ذکر کرتا، اقبالؔ کی تو بات بات میں اِک بات تھی۔ ان کی باتیں یاد کر کے میں میرؔ کا یہ مصرع ذرا تحریف کر کے پڑھا کرتا ہوں۔

مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں تمہاریاں

میرے پاس نہ تو دولتِ علم ہے، نہ دولتِ نظر اور نہ متاعِ دل، میں گنہگار اپنے مرشدِ کامل حکیم پاک زاد کے حضور کیا نذر پیش کروں۔ بہر حال اُن کی

فیضانی یادوں کو میں اپنے آنسوؤں کا نذرانۂ عقیدت اُن ہی کے ایک شعر کے ذریعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

''نذر اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار ازمن پذیر''

شفیق اشرفی

اقبالؔ اور فیضؔ

(چند مطابقتیں)

اُردو شاعری کی تاریخ میں جن شعراء کے ساتھ عظمت کا تصور وابستہ ہے ان کا آغاز میر تقی میرؔ سے ہوتا ہے اور اختتام غالبؔ پر۔ غالبؔ کے بارے میں ارباب تنقید کا اجماع ہے کہ وہ ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر ہیں اور پہلے بڑے جدید شاعر۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس پہلے جملے میں عظمت کے تصورؔ کو ۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل پر ہی اقبالؔ کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اقبال تو بلاشبہ عظیم شاعر ہیں لیکن ان سے قبل کے تمام عظیم شعراء کے یہاں غالب رنگ غزل کا ہے جبکہ اقبالؔ کی عظمت میں ایک اور صنفِ سخن جو بیسویں صدی اور مابعد کی خاصی پسندیدہ باوقار اور عمق کی حامل صنف قرار پائی یعنی نظم بھی شامل ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم غزل کے حوالے سے بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ جس شاعر نے کلاسیکی عہد کو جدید عہد سے جوڑنے کا کام کیا وہ بلاشبہ غالبؔ ہے لیکن اگر ہم غزل کے ساتھ نظم کو بھی

معرض بحث میں لائیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ جدید زمانے کے شعرا کو جس شاعر نے غزل کے ساتھ نظم کی روایت کو نیا رنگ دیا اور اسے آگے بڑھانے کا بنیادی فریضہ انجام دیا وہ اقبالؔ ہیں۔

اقبالؔ کی شاعری جس عہد میں ہمارے ادبی معاشرے کے مرکز میں جلوہ افروز ہوئی وہ عہد کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال جس طرح سامنے آتی ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔ البتہ اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت دنیا جن تیز رفتار تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی تھی اور جس کے نتیجہ میں فکر و اظہار کے نئے نئے اسالیب صورت پذیر ہو رہے تھے اس کے پیش نظر اگر ہم دیکھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان تبدیلیوں کو اقبالؔ نے سب سے زیادہ مؤثر انداز میں فکری اور فنی دونوں سطحوں پر اپنی شاعری کا حصّہ بنایا۔ اور صرف حصّہ ہی نہیں بنایا بلکہ اُنہوں نے ایسے نئے راستے بھی تلاش کیے جو آنے والے زمانے میں شاعروں کے لیے حد درجہ معاون ثابت ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بالخصوص حالیؔ کے خیالات کے زیر اثر اس بات پر بڑی شد و مد کے ساتھ اصرار کیا جانے لگا کہ ادب و شعر محض فنی اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ دنیا یا معاشرے کی تصویر بھی ہمارے سامنے آنی چاہئے۔ اس تصوّر کو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اور تقسیم ہند کے زمانے میں ترقی پسند مصنفین نے نہایت زور و شور کے ساتھ پھیلایا لیکن ان

کی شدّت پسندی نے بحیثیت مجموعی ادب کو شاید اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔

البتہ ترقی پسند حلقے میں بھی کچھ نام ایسے ضرور ہیں جنھوں نے شعروادب کی اصل روح کا لحاظ رکھتے ہوئے نئے خیالات اور تصورات سے اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن نئے راستوں کا اقبالؔ نے سراغ لگایا تھا۔ ان راستوں پر ان جدید عہد کے شعراء نے قدم بڑھایا۔ انہیں میں ایک اہم نام فیضؔ کا ہے۔ فیضؔ نے نہ صرف اقبالؔ کے ذریعہ تلاش کئے گئے راستوں پر اپنے نشانات امتیاز قائم کئے بلکہ اپنا رشتہ اسی روایت سے جدید شعرا میں سب سے زیادہ مستحکم طریقے سے قائم رکھا جو عظیم کلاسیکی شعرا کی روایت تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ فیضؔ صاحب نے اپنی نظموں میں بھی خود بہت زیادہ بلند آہنگ Vocal اور Loud نہیں جسے بالواسطہ طور پر کلاسیکی شعرا اور براہ راست اقبالؔ کا فیضانِ نظر کہا جا سکتا ہے۔

حالیؔ کے اثر سے جس طرح شاعری کو محض فنی اظہار سے آگے معاشرے کی تصویر، مسائل کے تئیں ردعمل، حالات وحوادث کے بیان وغیرہ سے عبارت کرنے کا چلن پڑا۔ اس کا اظہار ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے، مثلاً:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز دورنِ مے خانہ

شاعرِ مشرق کا محرمِ راز درونِ مے خانہ ہونا بسر و چشم تسلیم لیکن بقول شاعر ''ماورائے بھی ہے اک بات'' اور وہ بات یہ ہے کہ اگر ان کی نوائے پریشاں واقعی محض نوائے پریشان ہی ہوتی تو آج اقبالؔ عظمت کے اس بام پر نہ ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں عصر بولتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس کا لہجہ باتمکین، اس کا آہنگ باوقار اور اس کی گفتگو ایک خاص بلندی سے ہوتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں محاسن شعر اور فن کاری کے رمز شناسوں نے اعلیٰ شاعری کی بنیادی خصوصیات سے تعبیر کیا ہے اور ان کے یہاں یہ خصوصیات اور بیان کو شاعری بنانے والی دوسری تمام خصوصیات اپنے جمال و کمال کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اُن کے ذہن میں ''پرورشِ لوح و قلم'' کے ایک واضح معنیٰ ایک بہت بسیط و مکمل مفہوم کے ساتھ لازماً موجود ہے۔ اور جو دل پہ گذرتی ہے اسے رقم کرنے کے سلسلے میں حزم و احتیاط کا دامن وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ واردات کو تخلیقی تجربہ بنا کر اور اسے تراش خراش کر خاصے تکلف کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

فیض کی اس نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انہوں نے اقبالؔ کی عقیدت میں لکھی۔

آیا ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر
آیا وہ اپنی دھن میں غزل خواں چلا گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلۂ جوّالہ تندو تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز

ان اشعار کو محض خراج عقیدت کے طور پر نہیں بلکہ فکرِ اقبالؔ سے واقفیت رکھنے والے اسی قبیلے کے ایک دوسرے فرد کے مثبت ردِّ عمل کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ فیض نے صرف برائے شعر گفتن اقبالؔ کے گیت کو سب کے دلوں میں مقیم اور اس کے تمام محاسن کو لازوال نہیں کیا بلکہ اقبالؔ کے موقع بہ موقع شعری اظہارات (جو ہمارے موضوع کی مناسبت سے عہد اقبالؔ بالفاظ دگر بیسویں صدی کے نصف اول تک محدود ہیں) کی توسیع اپنے عہد کے تناظر میں کر کے

اقبالؔ کے تعلق سے اپنے خیالات و جذبات کا عملی اظہار بھی کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں ! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک! لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
(تصویرِ درد) اقبالؔ

اب بھی خزاں کا راج ہے، لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پُر افشاں ہوئے تو ہیں
ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
(اگست ۵۲۔ فیض)

دونوں اقتباسات میں مضمون اور طرزِ فکر اور کسی حد تک اظہاری صورتوں کی مطابقت ہے، بعد زمانی ضرور ہے لیکن دونوں شعرا کو اپنے اپنے زمانوں میں جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ان کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ارباب نظر واقف ہیں کہ اقبالؔ کی نظم تصویر درد بیسویں صدی کے اوائل کی ہے جب کہ فیض کی اس نظم کا عنوان ہی اگست ۵۲ یعنی آزادی کے بعد کی نظم ہے۔ اقبالؔ کے اقتباس کا بطور خاص آخری شعر یہ ہے۔

یہ خاموشی کہاں تک ؟ لذّتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تُو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

فیضؔ صاحب کے اقتباس کا آخری شعر پڑھئے۔

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

زمین پر دی گئی صدا کی گونج آسمانوں میں کرنے کی جو دعوت اقبالؔ دیتے نظر آتے ہیں ان کا سب کچھ لٹا کر بھی کلاہ کج کرنے کے فیضؔ صاحب کے

اصرار کے درمیان صوتی اور تخیّلاتی سطح پر نظر آیا ہے۔ اقبالؔ کے شعر میں رجائیت اگر براہِ راست سامنے آتی ہے تو فیضؔ کے یہاں یہ پہلو رجائی ہوتے ہوئے بھی پوری طرح واضح نہیں کہا جا سکتا۔ اس فرق کو بھی ہمیں زمانی فاصلے کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہئے کہ جس زمانے میں یہ باتیں کہہ رہے ہیں اس کا تقاضا یہ تھا کہ افراد کو امید ورجا کی تلقین کی جائے۔ جبکہ آزادی کے بعد کی صورتحال نے امید کی اس روشنی کو قدرے معدوم کر دیا۔ اس کی ایک اور صورت ہمیں ان دونوں شعراء کی ہم عنوان نظموں میں بہت واضح انداز میں نظر آئی ہے جو آغاز میں پیش کئے گئے خیالات کو استحکام بخشتی ہے ملاحظہ ہو۔

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟
یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمین، جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار
فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے
یعنی ترے آنسوؤں کے تارے

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل
(تنہائی: اقبالؔ)

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اِک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا
(تنہائی: فیضؔ)

ملاحظہ کریں نظم 'تنہائی' میں اقبالؔ نے جہاں اپنی بات ختم کی ہے فیضؔ نے وہیں سے اپنی شروع کی ہے۔ عموماً ایسا جملہ کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ثانی

الذکر اوّل الذکر کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بڑا ہے۔ ہمارا مقصد ہرگز ایسا نہیں ہے اور اس سے کسی ذہن میں اس خدشے کو سر نہیں ابھارنا چاہئے۔ ہم تو صرف دونوں ہم عنوان نظموں کے درمیان مطابقتوں کی نشاندہی ایک طالب علم کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دونوں نظموں کا لینڈ اسکیپ ایک ہے یعنی تنہائی شب۔ اقبالؔ کے یہاں آخیر تک آتے آتے شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر اس کی توجہ اُمید کے سب سے بڑے مرکز کی جانب مبذول کر دیتا ہے۔ جبکہ فیضؔ یاس و نا اُمیدی کی عجیب و غریب منزل پر کھڑے ہو کر دل سے گفتگو کرتے ہیں۔ اقبالؔ کی اس رجائیت کے پسِ پشت ان کے زمانے کے حالات ہیں۔ جبکہ فیضؔ کی نظم کی کیفیت ان کے عہد کے سوز و ساز اور درد و داغ سے عبارت ہے۔

اُوپر کی گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ اور فیضؔ کے سلسلے میں مطابقتوں کے کئی پہلو تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں سے چند کی طرف اشارے کئے گئے مطابقت کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور دونوں شعراء کے فکر و اظہار کی صورتوں کو الگ الگ انفرادی صورت میں دیکھنے پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ اور فیضؔ کے تخلیقی سرچشمے اگرچہ پوری طرح ایک نہیں ہیں لیکن دونوں کا تعلق فکری اعتبار سے ان تصورات سے بھی ہے جو بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کے حاوی تصورات تھے۔ لہٰذا ان کے طرز فکر اور انسان اور دنیا کے

بارے میں ان کے رویّے میں ایک حد تک مماثلت ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبالؔ اور فیضؔ کے یہاں مطابقت اور مماثلت کے ان مذکورہ پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ہمیں یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس سے ان دونوں شاعروں کا پوری طرح یکساں ہونا یا ان کے فکر وفن کی دنیا کا ایک ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ جہاں اقبالؔ کا رشتہ جدید زمانے سے قائم کرتے ہوئے ہم ان کے مخصوص نظام فکر کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ اور جس کا رشتہ اسلامی افکار و تصورات اور انسان و کائنات، خدا اور تقدیر وغیرہ سے جوڑتے ہیں۔ وہیں فیضؔ کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے اس نظریہ حیات کو ضرور سامنے رکھنا چاہئے جسے اشتراکی تصور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر بڑا اور اہم شاعر اپنے عہد کے غالب رجحان سے پوری طرح چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ اس رجحان کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کی شاعری میں جہاں ہمیں ترقی پسند فکر کے عناصر نظر آتے ہیں۔ اُنہیں ہم کو اس زاویے سے دیکھنا چاہئے۔ اقبالؔ کے بعد یہ ترقی پسند فکر دراصل فیضؔ کی شاعری میں ہی پوری قوت سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور یہی بات فیضؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے پیش کی گئی اس تحریر کا جواز ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمان

یونیورسٹیوں میں
مُطالعہ اقبالؔ کے دس سال
۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۸ء تک

(۱)

اقبالؔ اردو ادبیات کی ان چند استثنائی شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے ذکر و فکر کو غیر منقسم ہند میں پی ایچ۔ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کے لئے اوّل اوّل منتخب کیا گیا۔ اُردو شعر و ادب کی کوئی ساڑھے پانچ صدی کی تاریخ میں اقبالؔ سے پہلے صرف تین اشخاص کو پاک و ہند سے باہر یورپ میں پی ایچ۔ڈی کا موضوع بنایا گیا۔ قاضی محمود بحرؔی کو ان کے انتقال (۱۷۱۷ء) کے قریب سوا دو سو برس بعد[۱] مولانا الطاف حسین حالیؔ کو ان کے وصال (۱۹۱۴ء) کے کوئی بیس اکیس برس بعد[۲] اور مولانا محمد حسین آزادؔ کو ان کے انتقال (۱۹۱۰ء) کے کوئی تیس برس بعد[۳]۔ بحرؔی اور حالیؔ پر کیا گیا اولین تحقیقی کام آج تک روز اشاعت کا منتظر اور طباعت کی روشنی سے محروم ہے۔ آزاد پر لکھا گیا تھیسس ڈگری ملنے کے کوئی

پینتیس برس بعد شائع ہو پایا۔[۴]

اس عقب میں اقبالؔ کی خوش بختی قابل رشک ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں تحقیق اور توجہ کا مرکز بن گئے تھے اور ان کے انتقال (۱۹۳۸ء) کے پانچویں ہی برس (۱۹۴۳ء) ان پر کئے گئے تحقیقی کام پر ڈگری تفویض ہوگئی اور ڈگری تفویض کئے جانے کے معاً بعد (۱۹۴۴ء میں) یہ تھیسس شائع بھی ہوگیا۔ یہ امتیاز اور اختصاص اقبالؔ کے علاوہ اُردو شعر و ادب کی کسی دوسری شخصیت کو نصیب نہیں۔

(۲)

اقبالؔ پر پی ایچ۔ ڈی کا کام کرنے کا اولین اعزاز عشرت حسن انور کو حاصل ہوا۔ ان کا مقالہ The Metaphysics of Iqbal انگریزی میں ہے اور اس پر انہیں شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی زیر نگرانی کام کی تکمیل پر ۱۹۴۳ء میں ڈگری ملی۔ ۱۹۴۴ء میں یہ مقالہ لاہور سے شائع ہوا۔[۵] ۱۹۷۷ء میں اقبالؔ کی صد سالہ تقریبات ولادت کے موقع پر اس مقالے کا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں سامنے آیا۔[۶] اس ترجمے کا دوسرا ایڈیشن بھی اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔[۷]

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد بوجوہ اقبالؔ پر توجہ بڑھی اور برعظیم پاک و ہند سے باہر بھی وہ متعدد یونیورسٹیوں میں اعلیٰ علمی اسناد کے لئے تحقیق کا

موضوع بنے۔ اقبالؔ کے انتقال (۱۹۳۸ء) سے ۱۹۷۷ء تک کے کوئی چالیس برسوں میں یعنی علاّمہ اقبالؔ کے صد سالہ جشن ولادت تک کی حد زمانی میں میرے علم ونظر کی حد تک اقبالؔ پر سات مختلف زبانوں میں اکیس مقالے لکھے گئے ان میں سے نو انگریزی زبان میں ہیں، چھ اُردو میں، ایک چیک زبان میں، ایک جرمن، ایک فرینچ، ایک عربی اور ایک فارسی زبان میں ۔ ایک مقالے پر جو انگریزی زبان میں ہے ابھی ڈگری تفویض نہیں ہوئی۔ بقیہ بیس مقالات پر دنیا کے نو ممالک (پاکستان، بھارت، ایران، مصر، چیکوسلواکیہ، انگلستان، فرانس، جرمنی اور امریکہ) کی پندرہ یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی جا چکی ہیں۔

۱۹۷۷ء تک کے برسوں میں مندرجہ بالا اکیس مقالات کے علاوہ جو براہ راست اقبالؔ اور ان کے فکر وفن پر لکھے گئے، پاک و ہند سے باہر کچھ ایسے تحقیقی مقالات بھی احاطہ تحریر میں آئے ''اقبال'' جن کا مرکزی یا بنیادی موضوع نہیں ہے لیکن جن کا ایک یا بیشتر حصہ اقبالؔ کی تعلیمات اور افکار وتصورات سے بحث کرتا ہے۔ ایسے بعض مقالات کے کوائف دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گے:

1) Dr. Walter B Exans: "The Genesis of the Pakistan Idea: A Study of Hindu Muslim Relations" Southern California, 1955.

2) Dr. Muneerruddin Chaghtai: "Muslim Politics in

the Indo Pakistan Subcontinent." Oxford 1960.

3) Dr. Lini S.May: "Muslim thought and Politics in India after 1857." California, 1963.

4) Dr. Mushirul Haqq: "Religion and Politics in Muslim India after 1857." Mcgill, 1967.

5) Dr. Abdul Lateef: "From Community to nation: The Development of the Idea of Pakistan." Southern illinoise, 1966.

6) Dr. Sam Iftikhar: "The Pragmatic approach to the solution of educational problems in Pakistan." Syracuse, 1968.

7) Dr. Absar Ahmad: "Concept of self and self identity in Contemporary Philosophy"....(An affirmation of Iqbal's doctrine) London, 1973.

پہلے پانچ اندر جات کے لئے ڈاکٹر ممتاز اے۔ انور کی کتاب Doctoral Research on Pakistan میرا ماخذ ہے۸ جو۱۹۷۱ء تک غیر ملکی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لئے قبول کئے گئے مقالات کی بلیو گرافی پر مشتمل ہے۔

چھٹے اندراج کا ماخذ خود مقالہ نگار ہیں۔ڈاکٹر سام افتخار، لائبریری آف کانگریس واشنگٹن سے وابستہ ہیں اور اقبال انٹرنیشنل کانگریس منعقدہ لاہور

(۲۔۹ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں امریکی مندوب کے طور تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر سام افتخار نے مجھے بتایا کہ اُنہوں نے ۱۹۶۸ء میں سراکیوس یونیورسٹی، نیویارک سے ڈاکٹر رچرڈ کی زیرنگرانی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ دی کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے، ڈاکٹر سام افتخار کے بقول: مشرق اور مغرب کے فلاسفک، سوشل پولیٹیکل اور ایجوکیشنل تصورات کے مطالعے پر مشتمل ہے اور مقالے کا تین چوتھائی حصہ علامہ اقبالؔ کے افکار اور حوالوں سے مزیّن ہے۔''

اس سلسلے کے آخری حوالے کا ماخذ خود مقالہ نگار ڈاکٹر ابصار احمد ہیں جو شعبہ فلاسفی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنا تحقیقی کام پروفیسر ایچ۔ ڈی لیوئس (Prof. H.D.Lewis) کی نگرانی میں مکمل کیا۔[۹]

اقبالؔ کے صد سالہ جشن ولادت (۱۹۷۷ء) کے بعد یونیورسٹیوں میں ''اقبالیات'' کے مطالعے کا رجحان قوی تر ہوا۔ پی ایچ۔ ڈی کے ساتھ ساتھ ان کے اذکار و افکار پر ایم۔ فل کی متعدد اسناد بھی تفویض کی گئیں اور ایم۔ اے کے لئے لکھے گئے اقبالؔ سے متعلق مقالات کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۸ء کے دس برسوں میں پاکستان اور پاکستان سے باہر کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبالؔ پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا جو تحقیقی کام پایہ تکمیل

کو پہنچا اس کی معلوم تفصیل یہ ہے۔

۱) ڈاکٹر تاراچرن رستوگی :''اقبال پر مغربی اثرات'' گوہاٹی یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

۲) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی :''اقبالیات۔تصانیف اقبال تحقیقی وتوضیحی مطالعہ''

پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۸۱ء

۳) ڈاکٹر چمن لال رینہ :''اقبال اور آروبندو''

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سرینگر ۱۹۸۱ء

۴) ڈاکٹر محمد ایوب خاں :''اقبال اور اردو غزل''

شعبہ اُردو سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۸۲ء

۵) ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ :''اقبال کی اردو نظموں کا فنی وفکری جائزہ''

مدراس یونیورسٹی ۱۹۸۲ء

۶) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عبدالرحمٰن :''محمد اقبال وموقفہ من الحضارۃ الغربیہ''

کلیہ شریعت واسلامیات، جامعہ اُم القریٰ مکہ

۱۹۸۵ء

۷) ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی: ''اقبال کا فن'' ۱۰

مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ ۱۹۸۶ء

۸) ڈاکٹر محمد صدیق جاوید : ''فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ''

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۷ء

۹) ڈاکٹر رحیم بخش (شاہین): ''مکاتیب اقبالؔ کا تنقیدی جائزہ'' [۱۱]

سندھ یونیورسٹی جامشورو، حیدرآباد

۱۰) ڈاکٹر توقیر احمد خاں [۱۲]: ''اقبال کی شاعری میں امیجری''

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۸۸ء

تاراچرن رستوگی نے ''اقبال پر مغربی اثرات'' کے موضوع پر جموں و کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے پی ایچ۔ڈی کے لئے رجسٹریشن کرایا تھا۔ یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔[۱۳] اب ڈاکٹر گیان چند کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق انہوں نے اسی موضوع پر گوہاٹی یونیورسٹی سے انگریزی میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی ہے۔[۱۴] فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر گیان چند ان کے ممتحن تھے۔[۱۵]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی راہنمائی میں کام مکمل کیا۔ ان کے مقالے کو شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ''اقبالیات'' کے سلسلے کے اولین مقالے کا امتیاز حاصل ہے۔ ان کا یہ تحقیقی کام، پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ملنے کے بعد، سال بھر ہی میں چھپ کر، عام دسترس میں آچکا۔[۱۶]

ڈاکٹر چمن لال رینہ نے ''اقبال اور آروبندو'' کے موضوع پر تحقیقی کام انجام دیا۔ اسی موضوع پر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر ایم۔ رفیق کو ڈگری تفویض ہوئی تھی۔[۱۷] ڈاکٹر رینہ نے پروفیسر آر۔ کے شرما

صدر شعبہ ہندی کشمیر یونیورسٹی اور اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرینگر کے ڈائریکٹر پروفیسر آل احمد سرور کی زیرنگرانی پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ۱۸؎

ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے ۱۹۷۹ء میں پی ایچ۔ڈی کے لئے رجسٹریشن کرایا تھا۔۱۹؎ اُنہوں نے ۱۹۸۲ء میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی میں کام پورا کیا۔۲۰؎ محمد عبدالحفیظ نے مدراس یونیورسٹی سے پہلے ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی نگرانی میں ایم فل کیا۔ایم فل کے لئے ان کا موضوع تھا: ''اقبالؔ کی اردو نظموں کے افکار کا جائزہ'' اور پھر پی ایچ۔ڈی کے لئے اسی موضوع کو بڑھا کر اُنہوں نے ''اقبالؔ کی اردو نظموں کا فنی وفکری جائزہ'' کرلیا اور اس موضوع پر ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی نگرانی ہی میں تکمیل کار کی عزت حاصل کی ۲۱؎ اور ۱۹۸۲ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۲۲؎

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عبدالرحمٰن کے مقالے کا تعارف ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے کرایا ہے۔۲۳؎ اُنہوں نے بتایا ہے کہ مقالہ نگار نے ام القریٰ مکہ کے کلیہ شریعت واسلامیات میں، معروف مصری اسکالر محمد قطب کی زیرنگرانی تہذیب مغرب کے بارے میں علامہ اقبالؔ کے نظریات پر مبنی مقالہ مرتب کر کے ۱۹۸۵ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے اس مقالے کا ایک مختصر سا جزو عربی میں بعنوان ''اقبال وقضایا معاصرہ'' (اقبال اور عصری مسائل) سعودی عرب میں پاکستانی سفارت خانے نے نومبر ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے۔

(۴)

اقبالیات سے متعلق ۱۹۸۸ء تک کے دس برسوں میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مختلف شعبوں میں بہ تفصیل ذیل، درج ذیل اسکالرز کا پی ایچ۔ڈی کے لیے رجسٹریشن ہوا یا رجسٹریشن کے لیے ان کے معاملات زیرغور ہیں۔

۱) محمد آفتاب احمد : اردو شاعری پر اقبال کے اثرات
شعبہ اقبالیات، نگران: مرزا محمد منور، ۱۹۸۶ء

۲) ناہید سلطانہ : کلام اقبال میں اعلام واماکن کی فکری اہمیت
شعبہ اردو، نگران: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۹ء

۳) ثریا جبیں ملک : شارحین اقبال۔ تحقیقی وتنقیدی جائزہ،
شعبہ اقبالیات، نگران: مرزا محمد منور، ۱۹۸۱ء

۴) محمد یوسف مغل : اقبال کے فکر وفن پر عربی فکر وادب کے اثرات۔
شعبہ اقبالیات نگران: مرزا محمد منور، ۱۹۸۰ء

۵) صابر حسین کلوردی : باقیات شعر اقبال کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ،
شعبہ اردو، نگران: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۸۲ء

۶) غلام رسول عدیم : کلام اقبال پر عربی زبان وادب کے اثرات،
شعبہ اردو، نگران: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۸۸ء

۷) غلام رسول محمد :علامہ اقبالؔ کی اردو نظم ونثر میں مشرقی اثرات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

شعبہ اردو نگران: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،
ڈاکٹر صدیق شبلی ۱۹۸۸ء

پہلے اسکالر محمد آفتاب احمد (ثاقب) نے تحقیقی کام پورا کرلیا ہے، مقالہ یونیورسٹی میں داخل کرادیا ہے۔ ممتحن مقرر ہو چکے ہیں۔ دو برس سے نتیجے کا انتظار ہے۔ ناہید سلطانہ، ثریا جبیں ملک اور محمد یوسف مغل کی مدت کار ختم ہو چکی لیکن یہ اسکالرز کام ختم نہیں کر پائے۔ صابر حسین کلوروی مصروف کار ہیں اور ان کی مدت کار کسی قدر باقی ہے۔ ۲۳

غلام رسول عدیم اور غلام رسول محمد کے پیش کردہ خاکوں اور کتابیات پر غور کرنے کے لئے اردو بورڈ آف اسٹڈیز (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے اجلاس منعقدہ ۳ نومبر ۱۹۸۸ء میں ماہرین کا تقرر عمل میں آچکا، ان اسکالرز کی درخواستوں پر کوئی فیصلہ ماہرین کی آراء کی روشنی میں جلد متوقع ہے۔ ۲۴

(۵)

میرے علم اور اطلاع کی حد تک ۱۹۸۸ء تک کے دس برسوں میں بھارت کی سات آٹھ یونیورسٹیوں میں کوئی انیس اسکالرز اقبال سے متعلق پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی کام میں مصروف رہے ہیں:

۱) نذیر احمد بٹ : اردو ادبی تنقید میں اقبال شناسی کا مطالعہ ۲۵

نگران کار: ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر ۱۹۷۷ء

۲) غلام نبی حلیم :اقبال اور تصوف ۲۶

نگران: ڈاکٹر اسد اللہ کامل

شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، ۱۹۷۸ء

۳) شہناز اختر :اقبال کے فکر وفن کے سماجی اور تہذیبی رشتے ۲۷

نگران: ڈاکٹر عبدالحق

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۷۹ء

۴) وینس چند :اقبال اور دنگر ۲۸

نگران: ڈاکٹر امیر عبداللہ خاں شاہین، میرٹھ

یونیورسٹی ۲۹ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، کلکتہ

یونیورسٹی ۳۰ ۱۹۷۹ء

۵) فہمیدہ خاتون :اقبال کی شاعری میں ہندوستانی قومیت کے

تصورات

نگران: ڈاکٹر عبدالرؤف

شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء

۶) محمد امین اندارابی :اقبالؔ کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ[۳۱] ۱۹۸۱ء

۷) نصرت اندرابی :حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کی پیامی شاعری۔ تقابلی مطالعہ [۳۲]، ۱۹۸۱ء

۸) شفیقہ رسول :اقبالؔ اور ہیومنزم[۳۳] ۱۹۸۱ء

۹) بلقیس سراج :اردو نظم میں اقبالؔ کا کارنامہ[۳۴] ۱۹۸۱ء

۱۰) فریدہ بانو :اقبالؔ اور کشمیر[۳۵]، ۱۹۸۲ء

۱۱) شجاع الدین :فکر اقبالؔ اور ہم عصر فکری رجحانات[۳۶]
نگران: پروفیسر منظر عباس نقوی،
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۴ء

۱۲) شیخ ناصر بیگم :مغربی تہذیب، اقبال اور ہم عصر فکری رجحانات[۳۷]
نگران: پروفیسر رضی الدین احمد
شعبہ اردو شری ونک ٹیشور یونیورسٹی، تروپتی، ۱۹۸۴

۱۳) بی زینت النساء: اُردو شاعری میں تعلیمی تصورات اکبرؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے یہاں[۳۸]
نگران: عبدالرزاق فاروقی، شعبہ اردو
شری ونک ٹیشور یونیورسٹی، تروپتی، ۱۹۸۴ء

۱۴) سید شرافت علی ندوی: اقبالؔ کی شاعری میں شخصیات ۳۹
نگران: پروفیسر عبدالقوی دسنوی
شعبہ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، ۱۹۸۴ء

۱۵) غلام قدوس : تفہیم اقبالؔ۔ایک جائزہ اور تنقید ۴۰
نگران: ڈاکٹر نجم الہدی
شعبہ اردو ایل این مھلا یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء

۱۶) ارجمند بانو : ریاست بھوپال اور مشاہیر ۴۱
نگران: پروفیسر عبدالقوی دسنوی ۴۲
شعبہ اردو، سیفیہ کالج بھوپال ۱۹۸۴ء

۱۷) محمد رضوان صدیق : مطالعہ اقبالؔ تاریخ اسلام کی روشنی میں ۴۳
نگران: ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
شعبہ اردو، ایل۔این مھلا یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء

۱۸) محمد فیاض ظفر : منظری شاعری بہ تخصیص علامہ اقبالؔ ۴۴
نگران: ڈاکٹر محمد طیب صدیقی، شعبہ اردو
ایل۔این مھلا یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

۱۹) فرزانہ رضوی : اقبالؔ کے اردو کلام کی شرحوں کا تجزیاتی مطالعہ ۴۵
نگران: پروفیسر آفاق احمد، شعبہ اردو بھوپال
یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

ان اسکالرز کی خیریت کے بارے میں اس دوران کچھ سن گن نہیں مل پائی۔ عجیب نہیں کہ بعض ترک کار کر چکے ہوں اور کچھ تکمیل کار میں مصروف ہوں یا خدا کرے کہ منزل مراد پا چکے ہوں۔

(۶)

پی ایچ۔ ڈی کے علاوہ گزشتہ دس برسوں میں اقبالیات سے متعلق ایم۔فل کی سطح پر بھی کام ہوا۔ ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ (مدراس یونیورسٹی) کے ایم۔فل کا حوالہ اوپر آچکا[۴۶] مدراس یونیورسٹی ہی سے ایم۔فل کا ایک اور کام ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی نگرانی میں اے۔عبدالخالق نے انجام دیا۔ ان کا موضوع تھا ''اردو کے اسلام پسند شعراء حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کا فکری جائزہ''[۴۷] ایک دوسرے ماخذ کے مطابق[۴۸] ایک اسکالر خورشید اختر نے ''اقبالؔ اور مارکسزم کے عنوان سے مقالہ لکھ کر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی سے (۱۹۸۰ء کے لگ بھگ) ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) سے ۱۹۸۶ء میں اقبالؔ سے متعلق دو مقالات پر عبدالرحمٰن قریشی اور محمد عبدالرحیم کو ایم۔فل کی اسناد عطا کی گئیں۔ عبدالرحمٰن قریشی کا موضوع تھا۔ ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کلام اقبالؔ کا حصہ'' اور محمد عبدالرحیم نے ''اقبالؔ اور تصوف'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔[۴۹]

صد سالہ جشن ولادت اقبالؔ کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی

سرینگر میں ''اقبال چیئر'' قائم کی گئی اور اس پر برعظیم کے معروف دانشور اور اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۷۹ء میں اس پروفیسر شپ کو اقبال انسٹی ٹیوٹ سے بدل دیا گیا اور سرور صاحب اس ادارے کے دائریکٹر قرار پائے جنہوں نے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے اسکالرز کی تربیت کو بھی انسٹی ٹیوٹ کا ایک مقصد ٹھہرایا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرینگر میں اقبالیات پر بہت ذوق وشوق اور انہماک کے ساتھ کام ہوا، انسٹی ٹیوٹ کے ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء کے دو برسوں کے کوائف میرے سامنے ہیں یہ بڑے امید افزا ہیں۔ اس عرصے میں درج ذیل تیرہ اسکالرز نے ایم۔فل کی ڈگری کے لئے تحقیقی کام کیا۵۰

۱) محمد امین اندارابی: اقبال کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ، ۱۹۸۱ء

۲) نصرت اندارابی: حالی، اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری۔ تقابلی مطالعہ ۱۹۸۱ء

۳) شفیقہ رسول: اقبال اور ہیومنزم، ۱۹۸۱ء

۴) بلقیس سراج: اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ، ۱۹۸۱ء

۵) زاہدہ پروین: اقبال پر غالب کے فکر وفن کا اثر، ۱۹۸۲ء

۶) فریدہ بانو: اقبال اور کشمیر، ۱۹۸۲ء

۷) زرینہ بٹ: اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ، ۱۹۸۲ء

۸) بشیر احمد نحوی: اقبال اور تصوف، ۱۹۸۲ء

۹) نذیر احمد شیخ: اقبال اور سوشلزم، ۱۹۸۲ء

۱۰) طالعہ افروز: اقبال اور فنون لطیفہ، ۱۹۸۲ء

۱۱) نثار حسین مسعودی: اقبال اور مولانا رومی، ۱۹۸۲ء

۱۲) سبھاش چندر آئمہ: اقبال اور جدید اردو شاعری، ۱۹۸۲ء

۱۳) محمد شفیع سنبلی: کشمیری شعراء پر اقبال کا اثر، ۱۹۸۲ء

ان اسکالرز میں سے پہلے دس کو ایم۔فل کی ڈگری مل چکی۔ موخر الذکر تین اسکالرز کام میں مصروف ہیں۔ ان سب اسکالرز کے کام کی رہنمائی کی خدمت پروفیسر آل احمد سرور نے انجام دی۔ ۵۱

(۷)

اقبال کے افکار و ادبیات پر ان کے انتقال کے بعد سے اب تک کے پچاس برسوں، یعنی نصف صدی کی مدت میں، مشرق تا مغرب پی۔ ایچ۔ ڈی یا ایم۔فل کی پچاس سے زائد اسناد دی جا چکی ہیں۔ ایم۔ اے وغیرہ کے لیے جو تحقیقی اور تنقیدی مقالات مختلف یونیورسٹیوں میں پیش کیے گئے ہیں، ان کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

''اقبال'' یونیورسٹیوں میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ٹھہرے۔ یہ امتیاز اردو شعر و ادب کی پوری تاریخ میں کسی بھی دور اور کسی بھی

مرتبے کی کسی دوسری شخصیت کے حصے میں نہیں آیا۔

ولؔی، میرؔ اور غالبؔ، اردو کے تین مسلمہ اکابر ہیں۔ اقبالؔ ان کے پیشرو ہیں لیکن وہ ولؔی، میرؔ اور غالبؔ سے ان معنی ہیں خوش نصیب میں کہ ولی کو ان کے انتقال (۲۰۔۱۷۲۵ء) کے کوئی ڈھائی صدی بعد ڈاکٹریٹ کا موضوع بنایا گیا۔ ۵۲ میرؔ (۱۸۱۰ء) پر ڈیڑھ صدی بعد اور غالبؔ پر ان کے انتقال (۱۹۶۹ء) کی کوئی آٹھ دہائیاں گزر جانے کے بعد ۵۳ ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ اسناد فضیلت عطا کی گئیں، جبکہ اقبالؔ پر کیے گئے تحقیقی کام پر ان کے انتقال کے پانچویں برس ہی ڈگری مل گئی اور ڈگری ملنے کا یہ عمل ایک فی سال سے بھی زیادہ کی اوسط سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ علامہ اقبالؔ ہمارے شعر و ادب کی ان خوش قسمت استثنیات میں سے ہیں جو حینِ حیات اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں اور ہماری درسگاہوں کا تو وہ بالخصوص بہت ہی مرغوب موضوع رہے ہیں اور آج بھی وہ سب سے زیادہ محبوب موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کشش اور توجہ میں ان کی عظمت، وسعت، ان کی گہرائی اور بحیثیت مجموعی ان کی آفاقیت کا اشارہ مضمر ہے۔

(دوسری اقبالؔ عالمی کانگرس، منعقدہ لاہور ۹۔۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء کے لیے لکھا گیا۔ نظر ثانی و اضافہ دسمبر ۱۹۸۸ء)

پسِ نوشت

ڈاکٹر سید شاہد اقبالؔ نے ''مگدھ یونیورسٹی سے اردو فارسی وعربی میں پی ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی فہرست مرتب کی ہے جس کے مطابق ''اقبالؔ کی شاعری میں خودی کا تصور'' کے موضوع پر اشتیاق احمد کو مگدھ یونیورسٹی' بودھ گیا سے ۱۹۸۴ء میں اردو میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ڈاکٹر اشتیاق احمد نے یہ تحقیقی کام ڈاکٹر افصح ظفر کی نگرانی میں پورا کیا۔

ڈاکٹر سید شاہد اقبالؔ کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق ''اقبالؔ کی شاعری اور اس کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر ایاز حسن کا شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا میں پی ایچ۔ڈی کے لیے رجسٹریشن ہوا ہے۔ایاز حسن کے کام کی نگرانی ڈاکٹر شکیب ایاز کے سپرد ہوئی ہے۔

(ہماری زبان، دہلی ۱۸ اگست ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲، ۳) (جنوری ۱۹۸۹ء)

حواشی

۱) ''قاضی محمود بحری۔ بارہویں صدی ہجری کا ایک صوفی شاعر۔ اس کا عہد، زندگی اور کارنامے'' ڈاکٹر محمد حفیظ سید، لندن یونیورسٹی، ۱۹۳۲ء

۲) ''حالی بحیثیت شاعر، نقاد اور سوانح نگار اور اردو ادب پر حالی کے اثرات'' ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد، لندن یونیورسٹی، ۱۹۳۵ء

۳) محمد حسین آزاد۔ حیات، خدمات اور اثرات: ڈاکٹر محمد صادق، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۴۰ء

۴) (i) مولوی محمد حسین آزاد۔ ہز لائف اینڈ ورکس مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء ص ۱۷۴

(ii) اردو ترجمہ باضافہ و ترمیم: مولانا محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۲۹۶

۵) کتابیاتی کوائف کے لیے رجوع کیجیے:

جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سید معین الرحمن، اقبال اکادیمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۵۹۔۴۰

۶) اقبال کی مابعد الطبیعیات، مترجم: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی اقبال اکادیمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۷ء، ضخامت ۹۹ صفحات

۷) مطبوعہ: اقبال اکادیمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۸ء ضخامت ۱۵۶ صفحات

۸) مطبوعہ: پاک بک کارپوریشن، لاہور، طبع اول اپریل ۱۹۷۶ء

۹) ڈاکٹر ممتاز اے۔انور نے مقالہ نگار کا نام ''سیمویل افتخار'' ریکارڈ کیا ہے جو درست نہیں۔انہیں ڈگری بھی ۱۹۶۸ء میں ملی، ۱۹۶۹ء صحیح نہیں۔

(ڈاکٹورل ریسرچ آن پاکستان، لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۱۹)

۱۰) ڈاکٹر ابصار احمد کا تحقیقی مقالہ ۱۹۸۶ء میں اقبال اکادمی لاہور سے چھپ گیا ہے (صفحات ۳۳۵)

۱۱) یہ مقالہ ''شعریات اقبال'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکا، مطبوعہ دہلی ۱۹۸۶ء صفحات ۳۴۱

۱۲) تحقیق، دوسرا شمارہ شعبہ اردو ہندو یونیورسٹی جامشورو ۱۹۸۸ء ص ۳۹۱

۱۳) ڈاکٹر توقیر احمد خاں فروری ۱۹۸۸ء میں لاہور تشریف لائے اور مجھے ان کے مقالے کا خاکہ دیکھنے کا موقع ملا۔

۱۴) عبدالقوی دسنوی، اقبال ریویو لاہور، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۵

۱۵) ڈاکٹر گیان چند، حقائق، الہ آباد ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۵۔۲۲۶

۱۶) مکتوب ڈاکٹر گیان چند، بنام ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۸۴ء

۱۷) تصانیف اقبال کا تحقیقی و توصیحی مطالعہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۲ء صفحات ۲۰+۵۰۴+۴۶

۱۸) تفصیل کے لیے دیکھئے جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۶۹

۱۹) اقبالیات، شمارہ ۲، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سرینگر ۱۹۸۲ء ص ۲۶۹

۲۰) مجلّہ سیفیہ یادگار اقبالؔ، جلد ہفتم، بھوپال ۸۰۔ ۱۹۷۹ء ص ۳۳۹

۲۱) (الف) ہماری زبان، دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۵۰

(ب) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۷

۲۲) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۷

۲۳) ہماری زبان، دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۵

۲۴) ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب۔ ایک جائزہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبالؔ اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۳۲، ص ۱۶۹۔۱۷۰، ص ۲۲۵، ص ۲۶۷

۲۵) ۱۹۹۰ء میں انہیں ڈگری مل گئی۔

۲۶) موضوعات منظور ہو چکے۔ اسکالرز کام میں مصروف ہیں۔

۲۷) ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء ص ۴

۲۸) ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء ص ۴

۲۹) ہماری زبان، دہلی ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء ص ۵

۳۰) ہماری زبان، دہلی ۲۲ جون ۱۹۷۹ء ص ۴

۳۱) شعبہ اردو میرٹھ کالج (میرٹھ یونیورسٹی) کے صدر ڈاکٹر امیر اللہ شاہین نے ایک موقع پر اس تحقیقی کام کے بارے مین لکھا ہے کہ ''راقم کے اس شدید احساس نے کہ اُردو اور ہندی حقیقی بہنیں ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی پورک یا جزو لاینفک ہیں، ان میں پائی جانے والی خلیج کو پاٹنے کے لئے کچھ مشترک موضوعات انتخاب کئے اور انہیں دوسرے شعبوں میں تعاون دے کے ریسرچ کرانے کا ذمہ لیا۔ ایسے موضوعات میں قابل ذکر

اقبالؔ اور دنگرؔ (پر) کام میرٹھ یونیورسٹی کے تحت کیا جارہا ہے۔''

(میرٹھ یونیورسٹی میں تحقیقی کام، ہماری زبان، دہلی ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ء ص ۸)

۳۲) ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء ص ۴

۳۳) ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء ص ۴

۳۴) ان اسکالرز نے ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں ان موضوعات پر پروفیسر آل احمد سرورؔ کی نگرانی میں اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ، سرینگر سے ایم۔فل کی اسناد حاصل کیں۔ پھر ان کے موضوعات کسی قدر توسیع کے ساتھ پی۔ایچ ڈی کے لئے منظور کر لئے گئے اور یہ پانچوں پروفیسر آل احمد سرورؔ کی زیر نگرانی پی۔ایچ ڈی کے لئے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ (اقبالیات، شمارہ ۲، سرینگر ۱۹۸۲ء ص ۲۶۹۔۲۷۰)

۳۵) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۸

۳۶) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۸

۳۷) یہ موضوع براہ راست (اور تمام تر) اقبالؔ سے متعلق نہیں لیکن اس کا ایک حصہ لازماً علامہ اقبالؔ کے ریاست بھوپال سے تعلق کے ذکر اذکار پر مبنی ہوگا۔

۳۸) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۷

۳۹) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۸ء ص ۲۰۰

۴۰) موضوع: اقبالؔ کی اردو نظموں کے افکار کا جائزہ (ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۷

۴۱) ہماری زبان، دہلی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۷

۴۲) محمد نعمان خاں، مجلہ سیفیہ یادگار اقبالؔ، جلد ہفتم، بھوپال ۸۰۔۱۹۷۹ء ص ۱۲۴

۴۳) ہماری زبان، دہلی ۲۲ نومبر ۱۹۸۶ء ص ۶

۴۴) (ا) اقبالیات، شمارہ ۲، اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۹۔۲۷۰

۴۵) (ب) اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ منزل بہ منزل، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، سرینگر ۱۹۸۳ء

۴۶) ان اسکالرز میں سے پہلے پانچ کا پی ایچ۔ڈی کے لئے داخلہ ہو چکا اور وہ پروفیسر آل احمد سرورؔ کی نگرانی میں تحقیقی کام میں لگے ہوئے ہیں۔(اقبالیات، شمارہ۲، سرینگر ۱۹۸۲ء ص ۲۷۰)

۴۷) ''کلیات ولی'' (ترتیب وتہذیب) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، لکھنو ڈی لٹ ۱۹۵۷ء (ہماری زبان، دہلی ۱۵ جون ۱۹۷۹ء، ص ۴)

۴۸) ''مطالعہ میرؔ'' ڈاکٹر سید نواب حسین، الہٰ آباد، پی ایچ ڈی ۱۹۵۰ء
(ہماری زبان، دہلی ۸ مئی ۱۹۷۹ء ص ۳)

۴۹) ''غالب، ہز لائف اینڈ پرشین پوئٹری'' ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی، بمبئی، پی ایچ۔ڈی ۱۹۴۷ء (شہنشاہ سخن مرزا غالبؔ کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء، ص ۱۵)

ڈاکٹر علی محمد صدیق

روایت، اقبالؔ اور شریعتی

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ برصغیر نے علامہ اقبالؔ کی شکل میں ایک ایسی نادرِ روزگار شخصیت کو جنم دیا جس نے اسلامی فکر کی تشکیلِ نو میں نمایاں کردار ادا کیا ہے تو یہ چنداں بڑا دعویٰ نہ ہوگا۔ کیا یہ کم اہم بات ہے کہ چار عشروں کی حیرت انگیز تبدیلیاں اس دعوے کی سچائی پر صاد کرتی چلی جا رہی ہیں۔

جدید ترکی کے انقلاب سے لے کر ۱۹۷۹ء کے ایرانی اسلامی انقلاب تک نہ جانے کیا کچھ ظہور پزیر ہوا ہے، لیکن علامہ اقبالؔ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ایک طرف مصطفےٰ کمال کے انقلاب کے پر جوش حامی تھے اور دوسری طرف وہ ایرانی انقلاب کے فکری رہنما ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کے ہیرو ہیں۔ پتہ نہیں کہ روایت پرست، اقبالؔ کی انقلاب دوستی کے بارے میں کیا لائحہ عمل اختیار کریں گے۔ ایرانی انقلاب سے پہلے کی اقبالؔ شناسی اور ایرانی انقلاب کے بعد کی اقبالؔ شناسی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور رونما ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے 'ما و اقبالؔ' میں علامہ اقبالؔ کی فکر کی بعض ایسی جہتوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو فلسفہ اقبالؔ کے تین اہم

اجزا 'درد' 'عشق' اور 'عمل' کی بڑی کامیاب بلکہ انقلابی تصریحات اور تشریحات کا درجہ رکھتی ہیں۔

انقلاب ایران کے بعد شائع ہونے والے 'ماوا قبال' کے ایڈیشن میں سرسید احمد خان کے افکار کی بابت تفصیلی باب شامل نہیں ہے لیکن کتاب کے مطالعے سے اس کمی کا چنداں احساس نہیں ہوتا چونکہ علامہ اقبال اور سرسید احمد خان کے مابین اس درجہ فکری ہم آہنگی ہے کہ اقبال شناسی اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو پاتی جب تک اس سفر نے سرسید فہمی کی منازل طے نہ کر لی ہوں۔

علامہ اقبال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تقلید پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے باوجود 'اسلامی فکر کی تشکیل نو' جیسے عنوان کے تحت اہم خطبات دیئے اور اسلامی فکر کے بنیادی دائرے سے پوری طرح وفادار رہتے ہوئے 'منجمد' فکر کے داعیوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ انسانی علم میں ہمہ وقت اضافے کے پیشِ نظر اسلامی فکر کی تشکیل نو کا فریضہ لابُدی ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اس حد تک آگے گئے کہ 'جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور فکر کے نئے دروازے کُھلتے چلے جائیں گے ان خطبات میں پیش کردہ خیالات سے زیادہ وزنی دلائل کے لیے راہ ہموار ہوتی چلی جائے گی'۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اقبال 'تشکیل جدید' میں ڈاکٹر علی شریعتی کی طرح جدید فلسفے کی زبان اور حوالے استعمال کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ 'باطنی تجربے' کے قائل ہوتے ہوئے بھی

جدید ذہن کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے وہ مغرب کے پیچھے ڈنڈا لے کر نہیں دوڑتے بلکہ وہ ان خطبات کے بارے میں 'جاوید نامہ' میں بڑی وضاحت سے فرماتے ہیں:

حرف تہہ دارے بہ اندازِ فرنگ
نالۂ مستانہ ای از تارِ چنگ
تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد
طبعِ من ہنگامہ دیگر نہاد

وہ حضرات جو افلاطون اور دیگر عینی فلاسفہ کے تتبع میں علم کے حسّی ادراک کا مذاق اڑاتے ہیں، یقینی طور پر قرآنی اسپرٹ کے مقابلے میں افلاطونی فکر سے زیادہ متاثر ہیں۔ اقبالؔ فرماتے ہیں 'اسلامی دنیا کی بیداری کی صورت میں یہ امر از بس ضروری ہو جاتا ہے کہ مکمل آزادیٔ فکر کو بروئے کار لایا جائے تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ یورپی فکر کا سرمایہ کیا ہے اور یہ فکر اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل نو میں کس درجہ ممد و معاون ہو سکتی ہے'۔

اقبالؔ مغربی فسق و فجور سے اپنی تمام تر بیزاری کے باوجود جدید مغربی علوم سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ ربائی معیشت کے پسِ پُشت زبردست

تکنیکی ترقی کے مضمرات سے پوری طرح واقف ہیں اور وہ 'درد'، 'عشق' اور 'عمل' پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ روحانی ترقی کا غلو مادی پس ماندگی پر منتج نہ ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دنیا 'حقیقی' اور 'عینی' حقیقتوں کے ملاپ کی خوگر رہی ہے۔ قرآن مجید نے 'تبدیلی' پر خاطر خواہ زور دیا ہے کہ یہ روحانی اور مادی زندگی کی ترقی پسندانہ جدلیت کا کلیدی نکتہ 'قلب' ہے۔ اسی لئے اقبالؔ سمجھتے ہیں کہ کائنات 'تکمیل شدہ' حقیقت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ہمہ وقت نئے امکان اور نئے ظہور کے لئے تڑپتی رہتی ہے۔ اقبالؔ توحیدی معاشرے کے قائل تھے۔ وہ تناقضات سے پاک معاشرے کے زبردست وکیل ہیں اور ڈاکٹر علی شریعتی نے بھی اقبالؔ کے تصورات کی بنیاد پر ایک ایسے 'توحیدی' معاشرے کا تصور پیش کیا ہے جو ایک طرف اندرونی تناقضات سے پاک ہو اور دوسری جانب ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہو۔ ڈاکٹر علی شریعتی لکھتے ہیں:

> 'شناختن مردانی مانند سید جمال و اقبال شناختن یک شخصیت فردی نیست، شناختن یک مکتب و شناختن یک ایدولوژی است و شناختن شرائط اوضاع و احوال خود ماں است۔ شناختن سید جمال و شناختن اقبال خود شناختن اسلام خود شناختن مسلمانان و شناختن زمان حال و آئندہ است۔[۱]

ڈاکٹر شریعتی نے بجا طور پر خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبالؔ دنیائے فکر کی بڑی شخصیات کے مقابلے میں اس وجہ سے منفرد ہیں کہ وہ فلسفۂ توحید' وحدتِ ذاتِ خدا' کے وکیل ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مشیّت الٰہی ہی مشیّت عوام ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے ایک ثانیے کی جدائی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اب ڈاکٹر شریعتی ذرا اور آگے بڑھتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ظلم و ستم اس وجہ سے روا رکھے گئے ہیں کہ طاقتوروں نے طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں پر حکومت کرنے کے لئے متعدد 'ازموں' کا سہارا لیا ہے۔ سامراج 'وحدتِ نسلِ انسانی' کا سب سے بڑا حریف بن گیا اور اس نے نہ صرف طاقت کے زور پر اپنی رعایا پر حکومت کرنے کا حق حاصل کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سامراجی معیشت بھی قائم کی جس نے فلسفۂ وحدتِ انسانی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اقبالؔ وہ واحد مُسلم فلسفی ہیں جنہوں نے مغرب کے قابل تقلید فکری ورثے کی پُر زور پذیرائی کے ساتھ سامراجی معیشت سے بھی گلو خلاصی حاصل کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر شریعتی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال:

> 'نہ یک عارف مسلمان است۔ مثل غزالی و یا مثل محی الدین عربی وحتیٰ مثل مولوی (مولانا روم) کہ تنہا و تنہا بہ آں حالات عرفانی ماورائی بیاندیشد، و بہ آں تکامل فردی و تزکیہ نفس و درون روشن خویش و یا چند تنی چوں خویش فقط بساز دداز بیرون غافل بماند و از حملۂ مغول، استبداد حکومت و استعبادِ خلق خبردار نہ شود'۔۔۔[۲]

ڈاکٹر علی شریعتی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبالؔ کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ 'اُن کا دل عیسیٰ کی مانند، فکر سقراط کی مانند اور ہاتھ قیصر کی طرح تھا۔ لیکن اقبالؔ ان تمام اوصاف کے باوجود انسان تھا'۔

ڈاکٹر علی شریعتی اسلامی جمہوریۂ ایران کے نظریاتی قائد تسلیم کئے جاتے ہیں اور علامہ اقبالؔ ایرانی انقلاب کے اس معزز نظریاتی قائد کے ہیرو ہیں۔ ایرانی انقلاب کے پسِ پشت کارفرما عالمگیر سامراج دشمن تحریک کا حصہ ہے اس لئے روایت پرستی کی ہر تحریک صرف اسی صورت میں عوام دوست قرار پا سکتی ہے جب وہ عدل اور مساوات کی نقیب ہو۔ گزشتہ دنوں علاّمہ اقبالؔ کا ۱۰۴ واں یوم پیدائش ایک ایسے موقعے پر منایا گیا جب اسلامی دنیا ایسے تمام مفکرین سے اپنے رشتے کاٹ رہی ہے جو 'روایت' کے نام پر معاشی پس ماندگی کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے درمیان بعض ایسے مضحکہ خیز حضرات موجود ہیں جو ظلم کی جڑیں نکال باہر پھینکنے کے بجائے مابعد الطبیعاتی موشگافیوں میں اُلجھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اقبالؔ اور شریعتی مغرب زدگی کے خلاف ہیں۔ لیکن وہ ہمہ دم متغیر کائنات کی تسخیر کے پُر جوش وکیل اور مذہبی فکر کی 'تشکیلِ نو' کے قائل ہیں۔

ڈاکٹر شریعتی اپنے کتابچے 'آرٹ اپنے مسیحا کے انتظار میں' Art

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 – 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے ۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے با آسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک:

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

Awaiting the Messiah میں زندگی اور ادب کے بارے میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ علاّمہ اقبالؔ اور شریعتی کے مابین قدر مشترک کے تعین میں قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے۔

'کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس اتنا ہی کافی ہے کہ (یعنی یہ کہ صرف ثقافتی اقدار سے استفادہ کیا جائے) ہمیں اپنی مخصوص ثقافت کی جانب پلٹ جانا چاہئے۔ لیکن یہ محض ہمارا نقطۂ انحراف ہے۔ یہ صرف ہمارا نعرہ ہے ہمیں اس نعرے کے فی الفور جواب کی بابت غور کرنا ہوگا کہ آخر ہماری اصل کیا ہے۔ یعنی ہم ثقافت سے کیا مراد لیتے ہیں جس کی جانب مراجعت مقصود ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جس معاشرے کا مقسوم تعطّل اور جمود ہو وہاں معانی کا مقسوم بھی اندوہناک ہوجاتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ اٹھایا جاتا ہے یا خیال پیش کیا جاتا ہے اس کی شنوائی تک نہیں ہوتی بلکہ مسئلہ یا خیال کی بابت غور وفکر کئے بغیر مخالفت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اُسے محض عقل اور الفاظ کے ذریعے

نہیں دبایا جاتا بلکہ اس مقصد کے لئے دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جاتے ہیں'۔

'اپنے اصل کی جانب مراجعت' کا خیال اب اس نوبت کو پہنچا ہے کہ جن لوگوں نے اسے پہلے پیش کیا تھا وہ اس الزام سے بری الذمہ ہونے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں کیونکہ 'اصل کی جانب مراجعت' کے موقف سے یہ مطلب سمجھا جانے لگا ہے کہ توہمات کا احیا کیا جائے۔ اپنے 'اصل' کی جانب پلٹنے کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ اپنی خصوصیات کو از سرنو دریافت کیا جائے اور تعمیری ترقی کرنے والے متحرک ثقافتی پہلوؤں کی تلاش کی جائے جو ماضی میں معاشروں اور تہذیبوں کا باعث بنے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان مسائل کی طرف لوٹ جائیں جو وقت اور ضرورت کے تحت ترک کئے جا چکے ہیں اور اب مردہ مادے کی مانند ہیں۔ ہمارا روّیہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم عالمِ انسانیت سے رشتے استوار کریں۔ جب ہم اپنی ثقافت کو غیر ملکی اقدار کے تسلط سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری اولین ذمہ داری

یہ بنتی ہے کہ توہمات، فرسودہ اقدار اور ایسے تمام عناصر کو رد کر دیں جو اقوام کو اندھا اور کمزور کر دیتے ہیں اور انہیں تخلیقی عمل، جدّت، ترقی اور مسلسل ارتقا سے باز رکھتے ہیں ۔ ہم کیا ہیں اور ہماری ثقافت کیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں سائنسی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ آرٹ بھی اسی تلاش کا ایک ذریعہ ہے۔ [۳]

ڈاکٹر شریعتی کے معروف کتابچے کا مندرجہ بالا اقتباس جدید اسلامی انقلابی فکر کے ایک اہم رخ کی عکاسی کرتا ہے۔ جب میں نے ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر شریعتی کی فکر کے بارے میں ماہنامہ 'افکار' کے اداریوں اور روزنامہ 'ڈان' میں ایریل (Ariel) کے کالموں میں قارئینِ ادب کی بار بار توجہ منعطف کرائی تو بعض حلقوں نے اسے 'روایت بیزاری' سے تعبیر کیا تھا جب کہ میرا موقف اپنی قوم کی معاشی پس ماندگی پر اظہارِ تاسف کے سوا کچھ نہ تھا۔

اگر اسلامی دنیا سرسید احمد خان، علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر علی شریعتی کے راستے پر گامزن نہ ہو سکی تو اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کا کام بہت مشکل ہو جائے گا۔

حوالہ جات

۱) ڈاکٹر علی شریعتی، 'ماوا اقبالؔ'، ص ۲۵

۲) ایضاً، ص ۳۳

۳) ڈاکٹر علی شریعتی، 'آرٹ اپنے مسیحا کے انتظار میں' (ایران: شریعتی فاؤنڈیشن، تہران، ۱۹۷۹ء) ص ۶ تا ۷

ڈاکٹر محمد شفیع

علاّمہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری

کشمیر کی وادی نے نہ جانے کتنے خوبصورت پھل اور خوشبو دار پھول شعراء اور ادباء کے روپ میں عطا کئے ہیں۔ جن کی مہک سے سارا ہندوستان ہی نہیں پوری کائنات معطر ہوئی ہے یہ سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور شاید چلتا ہی رہے گا یہ اور بات ہے کہ بہار کے بعد خزاں کا دور آتا ہی ہے مگر خزاں کو بھی بہار کی تیاری کا دور سمجھنا چاہئیے۔

آیئے ہم کشمیر کے اس زمانہ بہار کی بات کریں جب ان دو خاندانوں کی سرسبزی و شادابی دیکھنے کے قابل تھی جن کی شاخوں سے پیدا ہونے والے گلاب آنے والے زمانے میں اردو ادب کے چمن کو مہکانے والے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان اس شخص کا تھا جسے لوگ شاعر مشرق حکیم الامّت، ترجمان الحقائق علاّمہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کے نام سے جانتے ہیں اور دوسرا وہ تھا جسے لوگوں نے انڈین شیکسپیئر اور بھارتیہ کالیداس کے روپ میں آغا حشر کاشمیری کے نام سے پہنچانا۔

اردو ادب کے ان دونوں عظیم پھولوں کے پودوں کی شاخ کشمیر کے

باغ سے لاکر سیالکوٹ اور امرتسر کی کیاریوں میں لگائی گئی۔ سیالکوٹ کی شاخ کے پودے سے جس حسین پھول نے ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو آنکھ کھولی اسے محمد اقبالؔ نام دیا گیا اور امرتسر یا بنارس میں ۴ر اپریل ۱۸۷۹ء کو جس گل نے زندگی پائی اسے آغا محمد شاہ کے نام سے جانا گیا جو بعد میں حشر ہوئے۔

کسے معلوم تھا کہ ان گلوں سے اٹھنے والی خوشبو ساری دنیا کو اپنے حصار میں لے لیگی جب تک یہ گل کھلے رہے اپنی دلفریب خوشبو سے دنیا کو مہکاتے رہے یہ بات الگ ہے کہ محسوس کرنے والا یہ ہمیشہ سوچتا رہا کہ خوشبو تو الگ الگ ہے مگر ان میں کوئی مشترک چیز ضرور ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں اقبالؔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ چلے گئے اور آغا حشر اس وقت کے طلسم، ڈرامے کی دنیا میں اپنی قسمت آزمانے بمبئی چلے آئے۔ دونوں نے اپنے سفر سے پہلے شعر و شاعری کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا اقبالؔ نے لاہور کے مشاعرے میں اپنا یہ شعر پڑھ کر تہلکا مچا دیا تھا۔

''موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے جبیں پہ عرق انفعال کے''

اور آغا حشر احسؔن کے مشہورِ زمانہ منظوم ناٹک ''چندراولی'' کا جواب ''آفتابِ محبت'' کے روپ میں لکھ کر دادِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ اقبالؔ یورپ جانے سے قبل آرنلڈؔ جیسا مغربی استاد پا چکے تھے اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے لیکن حشر بمبئی جانے سے پہلے صرف ایک شاعر تھے اور ڈرامے کی دنیا میں اپنے قدم جمانا چاہتے تھے۔

اقبالؔ نے یورپ پہنچ کر دنیائے اسلام کی جو حالت دیکھی اس سے اُن کا جذباتی دل تڑپ اٹھا۔ وہاں کے عظیم شعراء مفکرین اور سیاست دانوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں، مختلف ممالک کا دورہ کیا، اپنے پرانے استاد آرنلڈ اور نکلسن کی رہنمائی حاصل کی اور عمیق مطالعہ کے بعد وطن واپس آئے۔ اس سے قبل وہ ''مخزن'' کے مضامین اور انجمن حمایتِ اسلام کی نظموں کے ذریعہ ادبی دنیا سے تعلق پیدا کر چکے تھے۔

آغا حشر نے بمبئی میں ہی بیسوی صدی کا سورج دیکھا۔ بیشک ان کی نظریں بھی ان حالات کی طرف تھیں جو عالم اسلام پر رونما ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے بمبئی کی شعری محفلوں میں اپنا رنگ جمایا اور پادریوں سے مناظرے پورے زور شور سے شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی میں وہ بہت جلد مشہور و مقبول ہو گئے یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت مناظروں میں مولانا ابوالکلام آزادؔ بھی اُن کے ساتھ تھے جن کی ادبی اور سیاسی زندگی کا

آغاز ہو رہا تھا۔ آغا حشر نے اسی درمیان ایک یوریشین لیڈی پیشنس کپور کی مدد سے انگریزی پر دسترس حاصل کی اور شیکسپیئر کو اس طرح اردو میں پیش کیا کہ عوام نے انہیں انڈین شیکسپیئر کا خطاب دے دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اردو کے مشہور شاعر فصیح الملک مرزا داغؔ دہلوی کی استادی کا ڈنکا پورے ملک میں بج رہا تھا ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ اقبالؔ اور حشر بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ڈاک کے ذریعہ دونوں نے اپنا کلام بھیج کر اصلاح چاہی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ ہی دنوں میں داغ سمجھ گئے کہ یہ دونوں استادِ کامل ہیں اس لئے انھیں اپنے کلام پر خود ہی نظرِ ثانی کر لینے کا مشورہ دے دیا۔

حالیؔ نے جو اردو شاعری میں الٹ پھیر کی تھی اس کے نتائج بھی اس دور میں شدت سے سامنے آئے۔ اقبال نے خوب خوب اور حشر نے حسبِ موقع حالیؔ کا اثر قبول کیا۔

غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اقبالؔ اور حشر ریل کی اُن پٹریوں کی طرح ہیں جو اسٹیشن سے چلتی تو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہی ہیں مگر آگے چل کر اپنی سمت بدل دیتی ہیں لیکن جب کسی اسٹیشن پر ملنا ہوتا ہے تو سگنل کے پاس آ کر ایک ہو جاتی ہیں۔ جس طرح دونوں کا بدن آہنی ہے اور ایک ہی سمت کو جا رہی ہیں، ٹھیک اسی طرح اقبالؔ و حشر بُنیادی طور پر شاعر ہیں جب راستے بدلے تو ایک فلسفہ میں گم ہو گیا دوسرا ڈرامے کے نشے میں کھو گیا۔

لیکن دونوں کے نظریہ میں جو خمیر تھا وہ اسلامی تھا۔ دونوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اردو کو وسیلہ بنایا دونوں کی منزل بھی ایک ہی تھی وہ یہ کہ ملک وقوم کی خدمت کر کے اسے سرخ رو کریں۔ اس دوران جو جس ماحول سے گزرا اس نے وہ اثرات قبول کر لئے۔ ۱۹۰۸ء میں جب اقبالؔ ایک فلسفی اور مفکر کا روپ لے کر واپس آئے تب تک آغا حشر ڈرامے کی دنیا میں منفرد اور وطن پرست ڈرامہ نگار بن کر مشہور ہو چکے تھے۔ ڈرامہ اسیر حرص کا یہ شعر بہت مقبول ہوا۔

مٹی ہی میں مٹی جو ملانی ہے بدن کی
بہتر ہے مِلا دو اسے مٹی میں وطن کی

ادھر اقبالؔ نے انجمن کے جلسوں میں ۱۹۱۱ء میں ''شکوہ'' پیش کی اور اس کے کچھ مہینوں کے بعد ایک عوامی جلسہ میں ''جواب شکوہ'' منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۱۲ء میں ''شمع وشاعر'' کی مقبولیت سے انجمن کے جلسوں کا وقار اور بڑھ گیا۔ جلسوں میں جہاں اسلام کی قدیم شان کو پر اثر انداز میں پیش کیا گیا وہیں مسلمانوں کی خستہ حالی کا بھی اس طرح ذکر کیا گیا کہ خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں انجمن کے سالانہ جلسہ کے موقع پر آغا حشر لاہور میں ہی تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اراکین نے انھیں جلسہ میں نظم پڑھنے کی دعوت

دی آغا حشر کے اندازِ بیان اور کلام میں جادو کا اثر تھا اس جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے مولانا علیم الدین سالک لکھتے ہیں۔

''تقریر کرتے ہوئے علم و معارف کے دریا بہا دیئے تمام حاضرین پر وجد کا عالم طاری تھا علماء کرام کی وہ جماعت جو اس سے قبل اراکین مجلس پر اس وجہ سے ناراض ہو رہی تھی کہ انہوں نے ایک ناٹک والے کو اسٹیج پر کیوں بلایا سر جھکائے بیٹھی تھی آخر آغا صاحب نے اپنی تقریر ختم کی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ علمائے کرام نے اٹھ اٹھ کر نہایت عقیدت مندی سے آغا صاحب کے ہاتھ چومے اس کے بعد آغا صاحب نے اپنی نظم شروع کی اس وقت محفل کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اہل درد رو رہے تھے، ملت بیضا کے شیدائی سکیاں لے رہے تھے، بوڑھے آہیں بھر رہے تھے اور نوجوان جوش کے مارے بے قابو ہو رہے تھے عوام پر سکتہ کا عالم طاری تھا بچّے بت بنے سناٹا کھینچے بیٹھے تھے آخر مناجات والا بند آیا آغا صاحب نے آستین چڑھا کر اثر میں ڈوبے ہوئے انداز میں پہلا شعر پڑھا۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

تمام محفل تڑپ اٹھی بے خودی اور اضطراری حالت میں ہزاروں ہاتھ دعا

کے لئے درگاہِ ایزدی میں بلند ہوئے اور آمین آمین کی آواز نے آسمان میں گونج پیدا کردی اس نظم کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ اس کے مطبوعہ نسخے جو ایک ایک آنہ میں فروخت ہونا شروع ہوئے تھے اسی جلسہ میں ایک پونڈ پر دستیاب نہ ہو سکے۔

آغا حشر کی اس نظم کا عنوان ''شکریہ یورپ'' تھا۔ مشہور نقاد انجمن آرا بیگم لکھتی ہیں۔ ''حشر کا شاعرانہ رنگ، زورِ بیان اور فنکارانہ صلاحیت ان کی دو مشہور و معروف اور معرکہ آرا نظموں ''شکریہ یورپ'' اور ''موج زم زم'' میں پوری طرح جلوہ گر ہے یہ نظمیں اقبالؔ کے رنگ میں لکھی ہوئی ہیں اور کچھ دیر کے لئے ان پر اقبال کی تخلیقات کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ الفاظ کی بندش، خطیبانہ انداز، جوشِ بیان، لہجے کا اتار چڑھاؤ، خیال اور فن کی آہنگی، طرزِ ادا کی دل آویزی اور ساتھ ہی فارسی زبان کے پرشکوہ فقروں نے ان نظموں کو شاعری کا ایک اچھوتا نمونہ بنا دیا ہے۔

لمحۂ فکریہ ہے کہ ۱۹۱۳ء تک اقبالؔ نے جو نظمیں تخلیق کیں یا منظرِ عام پر آئیں ان میں کوئی بھی نظم ایسی نہیں ہے جس کو پڑھ کر یہ کہا جا سکے کہ آغا حشر نے ''شکریہ یورپ'' اس کی نقل میں کہی یا اسے سامنے رکھ کر کہی نہ تو خیال کے اعتبار سے اور نہ ہی ہیئت کے اعتبار سے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ حشرؔ شمع و شاعر، تصویرِ درد، ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ضرور نظر

آتے ہیں مگر اقبالؔ کی وہ نظمیں جو ''شکریہ یورپ'' کے بعد منظرِ عام پر آئیں مثلاً خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور مسجد قرطبہ جیسی نظموں پر اس نظم کا اثر صاف طور پر جھلکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اقبالؔ کی کچھ مشہور نظموں کا اثر حشرؔ کے ان ڈراموں کے مکالموں پر دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے ان نظموں کے بعد لکھے۔ بہت سے اشعار بھی ایسے مل جاتے ہیں جن میں وہی خیال پیش کیا گیا ہے جو علامہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ بات بالکل صاف ہے کہ علاّمہ اور حشرؔ دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ حاصل کیا ہے تحقیق اس بات کی ہونا چاہیئے کس نے کس کا کتنا اور کس وقت اثر قبول کیا اور اس کے کیا نتائج نکلے۔

بات شکریۂ یورپ کی ہو رہی تھی اس لئے اس نظم کے کچھ حصّے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ کو اس کے رنگ اور معیار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

مدّتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا
سازِ ہستی مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی
شعلہ ریزیٔ نوا ہائے افسوس سرد تھی

دوسرے بند میں فرماتے ہیں۔

وہ پیامِ آخری، اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہورِ صدق ، جو پر وردہ الہام تھا
وہ تجلّیِ حقیقت جو ضلالت سوز تھی
گرمئ قلبِ محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالم تاب نے
زنگ فطرت دھودیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا
سنگ ریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیئے خاکسترِ افسر دہ میں
زندگی کی لہر دوڑادی حیات مردہ میں
شورشِ ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈالدی
شور بادل کا، تڑپ بجلی کی دل میں ڈالدی
ایک ہل چل پڑگئی جذبات زنگ آلود میں
آگ سی گویا لگادی تو دۂ بارود میں

ان اشعار کے بعد مسلسل نو اشعار فارسی کے ہیں جس میں اسلام کی

گزری ہوئی شان وشوکت کا بیان پر اثر انداز میں کیا گیا ہے اس کے بعد کہتے ہیں۔

ہاں چھڑک پیشانی ظلمت پہ افشانِ سحر
ٹانک دے دامان شب میں پھر گریبان سحر

یورپ کی کارگذاری کو ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں۔

اے زمین یورپ! اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریف ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کا شانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریّت نمناک ہے
خونچکاں رودادِ اقوامِ گریباں چاک ہے
صرف تصنیف ستم ہے فلسفہ دانی تری
آیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری

اور یورپ کے شکر گذار کچھ اس طرح طنز کے تیر برساتے ہوئے ہوتے ہیں۔

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امّتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
یک بیک خون تن بیجاں میں ہیجاں آ گیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفاں آ گیا
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے

اب اس نظم کا دعائیہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے
اے دعا! ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رخ گردش ایام کے
ڈھونڈتے ہیں اب مداواسوزشِ غم کے لئے
کر رہے ہیں زخمِ دل فریاد مرہم کے لئے
رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم تو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلّت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امّت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

اس نظم کے بارے میں خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں۔

''خدا لگتی کہنا اور حسّر کی اس نظم کو دیکھنا لفظوں اور معانی کے لشکر نا آشنا میدانوں میں کس شان سے چڑھ کر آئے ہیں طبیع مسلم کے کمانڈر نے کیسی ہوشربا مورچہ بندی کی ہے۔''

آگے لکھتے ہیں۔

''نظم شکریۂ یورپ'' کا یوں تو ہر مصرعہ کوہ آتش فشاں ہے مگر آخر کی دعا نہایت موثر اور آدمی کے خاکستانی پیکر میں ہلچل ڈالنے والی ہے جس کا جواب افق محفوظ پر ایک آنکھ کو منقوش نظر آیا۔ جناب آغا اور دوسرے مسلمانوں کو اطلاع دو کہ یاد رکھو۔ سلام قولا من رّب رَّحیم ۔یعنی رحمت والا پروردگار سلامتی کا قول دے چکا ہے تو پھر مسلم حق پرست کیوں ہراساں ہوتا ہے جب تک حق ہے

حقدار سلامت رہے گا''۔ حشؔر کی اس نظم کے بعد ہی علاّمہ کی مشہور نظمیں خضر راہ، طلوعِ اسلام اور مسجد قرطبہ وغیرہ وجود میں آئیں جن سے حشؔر کے خیالات کو اور پختگی ملی ۱۹۲۰ء میں خضر راہ منظر عام پر آئی علاّمہ نے فرمایا۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر ازنوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس و آئین و اصلاح ورعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

طلوع اسلام میں کہتے ہیں۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

علاّمہ کے خیالات آخر وقت تک یہی رہے انتقال کے دو برس قبل فرمایا۔

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

دوسری نظم ''موجِ زم زم'' ہے جو ۱۹۱۸ء میں پیش کی گئی اس نظم کے بیشتر خیالات علاّمہ اپنی نظموں میں پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ آغا حشرؔ نے یہاں علاّمہ سے استفادہ حاصل کیا ہے مگر طرزِ بیان ان کا اپنا ہی ہے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

''جلوہ پر وردِ چراغ خلوتِ الہام ہوں
میں امانت دارِ سوزِ سینۂ اسلام ہوں''

اس نظم کے بھی دعائیہ اشعار بے مثال ہیں:

''اے خدا دے زورِ دستِ خالد وحیدر ہمیں
پھر الٹنا ہے صفِ کفر و درِ خیبر ہمیں
مست تھی جس کے نشہ سے روح سلمان و بلال
ہاں پلا دے پھر وہی صہبائے کیف آور ہمیں
دل صنم خانہ بنا ہے یاد غیر اللہ سے
بت بھی اب کہنے لگے مسلم نما کافر ہمیں
المدد اے نعرۂ اللہ اکبر المدد
بت کدے کو پھر بنانا ہے خدا کا گھر ہمیں

تیری رحمت دیتی جاتی ہو تسلّی ساتھ ساتھ
لے چلے جب شر مساری جانب محشر ہمیں
تیرے در کو چھوڑ کر ہم بے نوا جائیں کہاں
یا بتادے اور کوئی اپنے جیسا گھر ہمیں
دوسروں کو زور و زر، دے عیش دے آرام دے
اور ہمیں اس دولتِ دنیا سے صرف اسلام دے

مشاہیر نے جو اثر اقبالؔ پر کیا ہے یا اقبالؔ نے جن حضرات کو متاثر کیا ہے اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اقبالؔ اور عجم، اقبالؔ اور مغرب کے ساتھ اقبالؔ اور مشرق کے عنوانات کے تحت مفصل جائزے لئے گئے غالبؔ، بیدلؔ، چغتائی، سرسید، شبلی اور حالیؔ وغیرہ جیسے پیش رو، انور کشمیری، گرامی، اکبر، جوش اور احسان تک لوگوں کی نظر پہنچ گئی مگر نہ جانے کیوں انہوں نے آغا حشر کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو۔

اس موقع پر میں اراکین کل ہند علاّمہ اقبالؔ ادبی مرکز بھوپال کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا کہ میں علاّمہ اور آغا حشرؔ کے تعلقات پر روشنی ڈال سکوں۔

حضرات! صرف یہی نہیں، کلام پر تو ایک دوسرے کے اثرات ہیں ہی

آغا حشرؔ کے ڈرامے بھی کلامِ اقبالؔ سے متاثر ہوئے ہیں اور مکالموں میں علاّمہ کے خیالات پیش کئے ۔ اقبالؔ کی نظموں میں بھی منظر کشی اور پر شکوہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ڈرامائی انداز بھی کثرت سے پایا جاتا ہے شاید یہ حشر کا اثر ہے مقامات اقبالؔ میں ڈاکٹر عبداللہ فرماتے ہیں۔

''یہ تو معلوم ہے کہ اقبالؔ نے باقاعدہ ڈراما نہیں لکھا لیکن جاوید نامے کی تشکیل کو ایک نوع کا ڈراما کہا جاسکتا ہے۔۔۔۔اس کا کیا علاج کہ اقبالؔ کے سارے فن میں ڈرامے کی روح بول رہی ہے اور کیا تعجب ہے کہ اگر ڈرامہ نگار کے لقب سے ملقب ہونے کا طوق دامن گیر نہ ہوتا تو شاید اپنے مغربی ہمدم گوئٹے کی طرح یہ بھی کوئی Faust لکھتے۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ اپنی شاعری میں ڈرامے کی سرحدوں تک جاجا کر اپنا رخ بدل لیتے ہیں اور اکثر صورتوں میں مکالمہ، مخاطبہ یا حکایت یا واقعاتی قطع کا انداز اختیار کر لیتے ہیں''۔

صاف ظاہر ہے کہ علاّمہ ڈرامہ نگاری سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے کلام میں بھی اس کے عنصر آ گئے بے شمار مثالیں اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہیں اس معاملے میں علاّمہ اور آغا حشرؔ کا لین دین بہت قریبی ہے بغیر کسی تمہید کے چند مثالیں دونوں کے کلام، نثری شہہ پاروں اور خطوط سے پیش کرتا ہوں آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ کون کس سے متاثر تھا اگر خیالات میں یکسانیت تھی تو کئی امور یر تضاد بھی پایا جاتا ہے مثلاً ۱۹۲۱ء کے اسہیوگ آندولن سے متاثر ہو کر حشر

کھدر دھاری ہو گئے اور گاندھی جی سے متاثر ہوئے اقبال گاندھی جی سے متاثر تو تھے لیکن لیگ کی طرف جھک گئے۔ دونوں حضرات لباس وخوراک کے معاملے میں ملتے جلتے تھے مثلاً دونوں کو آم بہت پسند تھا اقبال تو اپنی بیماری کے دنوں میں بھی آم نہیں چھوڑ سکے۔ جب اکبر الہٰ آبادی نے انہیں لنگڑا آم ارسال کئے تو علاّمہ نے کہا۔

ترے فیضِ مسیحائی کا ہے، یہ سب اثر اکبر
الہٰ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

انہوں نے اپنے خطوط میں بھی آموں کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ آغا حشر کی کمزوری بھی آم ہی تھے ۷/ جون ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں چرکھاری مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکریٹری یحیٰ علوی کو لکھتے ہیں۔ ''امسال آم کے درخت افزائش نسل کے بارے میں سخت بخیل ہو گئے ہیں مہاتما گاندھی کے مشورہ پر عمل پیرا ہو کر وہ نہیں چاہتے کہ ناکارہ اولاد سے بنارس کی زمین کو گرانبار کر دیں بارش کا موسم از خود رفتگی و مدہوشی کا زمانہ ہوتا ہے جب تپتی ہوئی زمین بھیگے ہوئے بادلوں کے لئے بلاٹنگ پیپر بن جاتی ہے ممکن ہے اس وقت یہ بھی افشردۂ آسمانی کے دس بیس قرابے چڑھا کر عالم سرخوشی میں مہاتما جی کے تخلیقی اصول سے بغاوت اختیار کر لیں اور میوہ فروشوں کے ٹوکرے ان کے رنگ برنگی بچوں کے لئے دایہ کی گود

کا کام دیں۔ ''بقائے اصلح کے اصولوں کے، مطابق بدترین میں بہترین کا انتخاب کر کے ایک سو دس (۱۱۰) آم روانہ خدمت کرتا ہوں آپ کو پسند آ گئے تو سبحان اللہ اور بدمزہ نکلے تو میری کوشش پر لعنت اللہ۔''

ملک وقوم کے اصلاح کی فکر دونوں کو تھی اس لئے انہوں نے وید، اپنشد، رامائن اور گیتا جیسی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا علاّمہ نے نانک، رام چندر جی، سوامی رام تیرتھ وغیرہ پر نظمیں لکھیں حشر نے بھاگیرتھ گنگا، مدھر مرلی، سیتا واس اور رام اوتار جیسے ناٹک لکھے یہ اور بات ہے کہ اقبالؔ کو کوئی نارائن پرشاد بیتابؔ نہیں ملا جو اُن سے ہندی میں نظمیں اسی طرح لکھا لیتا جیسے حشر سے ناٹک لکھوائے۔ اقبالؔ گائتری منتر کا ترجمہ کرتے ہیں تو حشر اسے مکالمے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں انہوں نے آفتاب کی برکتوں کا ذکر بڑے پراثر انداز میں کیا ہے۔

اقبالؔ کا ترجمہ گائتری منتر کے چند اشعار

اے آفتاب روح روان جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشہ تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضہ تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے، روحِ رواں ہے شعور ہے

اب اسی خیال کو حشر کے مکالموں میں دیکھیں۔

''دنیا کے لئے روشنی، پھولوں کے لئے مسکراہٹ، پرندوں کے لئے زمزمے، دریاؤں کے لئے ترنم ریز روانی، سوئے ہوئے قبائے عالم کے لئے بیداری کا پیغام لانے والا آفتاب، افق مشرق کی پیشانی پر تازے زرافشاں کی طرح چمک رہا ہے کتنا پر جلال نظارہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نہیں نورانی ایک کتاب ہے جس میں دنیا جاگنے کے بعد اپنی مرضی کے خواب کی تعبیر پڑھ رہی ہے۔ ستاروں کے ملک سے آیا ہوا ایک فرشتہ ہے جس سے کائنات کی ہر ایک شے زندگی کی برکتیں مانگ رہی ہے۔''

ہندی میں اسی خیال کو یوں لکھا۔

''ماتھے پر چندر ما کا شیش پھول، گلے میں تاروں کا ہار
اور انگ انگ میں چاندنی کے بیل بوٹے سے جگمگاتی
ہوئی شکل پکچھ کی ساڑی پہنے کئی دن کی جاگی ہوئی دلہن
کے سمان پرتھوی گہری نندرا میں سور ہی تھی۔ اس آلسیہ
ندرا سے جگانے کے لئے ملئے پون سے سگندھت پر
اتہہ کال کی پرتبھا نے اپنی انگلیوں سے گدگدانا پکچھیوں
نے گنگنانا اور کل کل مئی ندیوں نے کومل سورون میں گانا
شروع کیا آخر پرکرتی کے اس مدھرالاپ سے دیوی و
سندھرا ایک لمبی انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں اور ان کے
جاگتے ہی یہ سنسار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔''

کچھ عنوانات قائم کئے گئے ہیں اُن کے تحت علاّمہ اور حشر کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔

ملک وقوم سے غدّاری: اقبالؔ نے اپنی مثنوی ''جاوید نامہ'' میں ملک کے غدّاروں میر جعفر اور صادق کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے وہ بڑا ہی عبرت ناک ہے فرماتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

حشؔر کہتے ہیں۔۔۔''ملک کے نمک حراموں کو ملک کے دشمن بھی احترام سے نہیں دیکھتے۔''

ایک اور مکالمہ دیکھیں۔۔۔''وطن کا دشمن ارضِ وطن کی طرح خوبصورت، نعرۂ آزادی کی طرح پرجلال اور محبت قومی کی طرح قابل پرستش ہو پھر بھی دنیا کی بدترین ہستی ہے۔'' (رستم وسہراب)

مادرِ وطن:۔ علاّمہ کے مشہور اشعار ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

حشؔر کا خیال ہے۔۔۔ ماتا اور ماتر بھومی دونوں کا ایک ہی درجہ ہے جیسے ماتا جیسی کوئی استری نہیں۔ ویسے اپنی جنم بھومی جیسی کوئی بھومی نہیں اس لئے

ولایت کتنا ہی اچھا ہو ہمارے لئے بھارت سے کبھی اچھا نہیں ہوسکتا'' (دل کی پیاس)

صبح:۔اقبالؔ

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں باری

حشرؔ:۔''تمام شب کا جاگا ہوا چاند ستاروں کی روشنی گل کر کے سو گیا رات کی سیاہ چادر میرے آنسوؤں سے دھل کر سفید ہوگئی روشن دن مشرق کی کھڑکی کھول کر جھانکنے لگا'' (ترکی حور)

مرگ وحیات۔۔اقبالؔ ''زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز'' (یکم جون ۱۹۰۷ء کیمبرج کی ایک دعوت میں)

حشرؔ۔۔۔''موت کیا ہے ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام پر جانے کا نام ہے'' (رستم وسہراب)

اشعار اور دردِ دل۔۔۔حشرؔ

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق
اپنا غم، دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

یہ میری شاعری اے شرح دردِ الفت ہے
وہی سمجھیں گے اس کو جو زبانِ دل سمجھتے ہیں

اقبالؔ۔

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں ، صاحب ساز کا لہو
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

سیکڑوں اور ہزاروں مثالوں میں سے چند مثالیں بہت ہی مختصراً پیش کی گئی ہیں ضرورت یہ ہے کہ اس عنوان پر سنجیدگی سے تحقیقی کام ہونا چاہئیے ۔تصورِ خودی،تصورِ عشق،تصورِ آزادی،محبت ، رنگ و نسل اسلامی دنیا اور ملک کے اہم مسائل جیسے تمام امور پر ان دونوں حضرات کا نظریہ کہیں یکساں ہے اور حالات کے پیش نظر کہیں اختلاف بھی ہے ایسا کیوں ہوا؟ اقبالؔ کی زندگی میں ہی یعنی ۲۸/اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں ہی آغا حشرؔ کا انتقال ہوا لاہور کے اکابرین نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ۳۰/جون ۱۹۳۵ء کو حشر ڈے منانے کا فیصلہ ہوا۔ کمیٹی کے صدر احمد یار خاں دولتانہ،سکریٹری مولانا راغب احسن کے علاوہ علاّمہ اقبالؔ، چودھری شہاب الدین، مولانا ظفر علی، حکیم فقیر محمد چشتی سیف الدین کچلو

خلیفہ شجاع الدین، سردار پرتاپ سنگھ، مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، مظفر حسین شمیم، عبداللطیف تپش، پنڈت جیون لال، آتما سروپ شرما اور حفیظ جالندھری وغیرہ وغیرہ جیسے مشاہیر تھے۔ ان حضرات نے اپیل کی اور ارادہ کیا کہ کلامِ حشر شائع کرایا جائے (یہ اور بات ہے کہ وہ کام اب تک نہ ہوسکا) علاّمہ اس کمیٹی کے بہت ہی سرگرم رکن تھے۔ علاّمہ اقبال کا انتقال ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہی ہوا۔ ان کی زندگی میں ہی ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال ڈے لاہور میں ہی منایا گیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد تو لاہور اور پوری دنیا میں نہ جانے کتنی اقبال میموریل کمیٹیاں بنیں سبھی نے کچھ نہ کچھ کرنے کے ارادے باندھے۔ سمینار ہوئے اور ان کے کلام کو چھپوایا گیا اور ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے مگر افسوس کہ حشر کے انتقال کے بعد لوگوں نے انہیں فراموش کر دیا۔ حضرات! میرے اس مختصر مقالے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ علاّمہ اور حشر صرف ہمعصر ہی نہیں تھے ہم وطن اور ہم خیال بھی تھے دونوں نے ایک ہی استاد کا انتخاب کیا ایک بات اور بتادوں کہ دونوں حضرات نے اس وقت کے مدھیہ بھارت یعنی آغا حشر نے چرکھاری اسٹیٹ کے مہاراجہ کے یہاں اور علاّمہ نے بھوپال میں سر راس مسعود مرحوم کے یہاں اپنی زندگی کے سنہری دن گزارے اور شہہ پارے تخلیق کئے۔ دونوں کے اشعار کہنے یا لکھنے لکھانے کا ڈھنگ بھی یکساں تھا۔ یعنی کہ ایک کیفیت طاری

ہوتی تھی اور زبان سے اشعار یا مکالموں کا فوارہ پھوٹ نکلتا تھا۔ یہ لوگ کاغذ قلم لے کر فکر نہیں کرتے تھے یہ بولتے تھے اور آس پاس بیٹھے لوگ نوٹ کرتے تھے یا پھر ان حضرات کا حافظہ اتنا درست تھا کہ جب کلام نازل ہوا تب کہہ لیا اور بعد میں نوٹ کرا دیا۔ علاّمہ کے بارے میں مشہور رسالہ ''مخزن'' کے مدیر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

> ''ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور اپنی دھن میں کہتے جاتے میں نے اس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا ایک خاص کیفیت رقت کی ان پر عموماً طاری ہوتی تھی۔''

حشرؔ کے متعلق اُن کے محرّر گوکل پرشاد دھولیہ نے مجھے بتلایا (اس انٹرویو کو خادم نے اپنے تحقیقی مقالے آغا کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ میں شائع کیا ہے)۔

---''وہ آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگتے اور اسی دوران جب ان کا دل

چاہتا گلاس سے چسکی لیتے کچھ دیر بعد ناٹک لکھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے منہ سے مکالموں کا آبشار پھوٹ رہا ہو، ہنسی، آہ، واہ، پھسپھساہٹ، قہقہہ وغیرہ سبھی کچھ محرّروں کو لکھنا ہوتا تھا۔''

علاّمہ یورپ تشریف لے گئے انہوں نے باقاعدہ یورپ کے ادب کا مطالعہ کیا۔ تمام ممالک کا دورہ کیا۔ مشاہیر سے ملاقاتیں کیں۔ وہ پروفیسر بھی رہے اور بیرسٹر بھی، اُن کے دائرہ فکر میں پوری دنیا تھی۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہونے کے ساتھ ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ مذہب اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب پر ان کی گہری نظر تھی ان کا دل جذبۂ عشقِ رسول سے سرشار تھا۔ ویدانت سے انہیں گہرا لگاؤ تھا وہ مغربی مفکرین سے متاثر تو تھے لیکن مغربی تہذیب کی اندھی تقلید اور مغرب کی چالوں سے وہ بہت ناراض تھے۔ سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو پر اثر انداز منظّم طریقہ سے کہنا جانتے تھے، اسی لئے کامیاب بھی ہوئے۔

آغا حشرؔ میں بھی یہی تمام خوبیاں گنائی جاسکتی ہیں فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بیرونی ممالک کا دورہ نہیں کیا بلکہ تھیٹریکل کمپنیوں کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچے۔ وہ بھی قوم کی بے حسی سے پریشان تھے اور ان کی نظر میں ملک کے مسائل کا حل بہت ضروری تھا انہوں نے شراب، جہیز، ہندوستان میں عورتوں کی حالتِ زار کے علاوہ سیاسی سماجی اور مذہبی مسائل کو پوری طاقت سے اٹھایا اور

اس کا حل بھی بتایا۔

علاّمہ اقبالؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور اپنا پیغام پہنچا دیا۔ ورثہ میں جوشؔ و احسانؔ جیسے شاعر بھی دیئے۔

آغا حشرؔ کی کارکردگی یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سٹیج کا رخ موڑ دیا اس میں سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل کی باتیں ہونے لگیں جواب تک نہیں ہوتی تھیں۔

وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی بات کہنے کے لئے فلم اور شاعری کو بھی ذریعہ بنایا۔ اور اپنے خیالات موثر طریقہ سے لوگوں تک پہنچائے۔

آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ اقبالؔ پر مشاہیر کے جو اثرات ہوئے اور جو اثر اقبالؔ پر دیگر مشاہیر کا شعوری اور غیر شعوری طور پر ہوا ہے اس پر اب تک یقیناً بہت کام ہوا ہے مگر میرا خیال ہے کہ جس طرف خاکسار نے نشان دہی کی ہے اب تک غور طلب تھا۔ اقبالؔ کے شیدائیوں کی نظر اس طرف بھی ہونی چاہئیے۔ تحقیق کی راہیں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ میری گذارش ہے کہ محققین صدق دل سے اس طرف بھی توجہ فرمائیں پھر:

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

ڈاکٹر صابر کلوروی

شعری باقیات کی تدوین نو

(جواز، مسائل اور طریقہ کار)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کلام کو علامہ نے اپنی زندگی میں پسند نہیں کیا اسے ہم کیوں تحقیق اور تنقید کا موضوع بنائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تنقیدی رجحانات اب ۱۹۲۴ء کی نسبت بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ فن کار کے ضمن میں 'کیا' کی اہمیت کے ساتھ 'کیوں' کی اہمیت بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ نفسیات نے تخلیق کے پیچھے تخلیق کار کے ذہنی عمل کی اتھا گہرائیوں میں جھانکنا سیکھ لیا ہے۔ شعر اور شعور کے رشتے واضح ہو چکے ہیں۔ ایسی شاعری کے پیچھے جسے اقبالؔ پیغمبری کا جزو قرار دیتے ہیں ایک زبردست شخصیت کی قوتِ متخیّلہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ شاعر کے ذہنی ارتقاء کی سرگذشت کا بیان بھی نقاد کا منصب ٹھہرا ہے۔ خود علاّمہ کو بھی اپنے دل و دماغ کی سرگذشت سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ کیا باقیاتِ شعر اقبالؔ کے اس عظیم الشان ذخیرے سے صرفِ نظر کر کے ان گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنا ممکن ہے؟

اقبالؔ کے زیر بحث باقیات اقبالؔ کے نظریاتی اور فکری ردّ وقبول کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ کا ذہن مختلف اوقات میں کن کن واقعات اور تحریکوں سے متاثر رہا اور اس نے اقبالؔ کی شاعری کی مجموعی فضا کو کہاں تک متاثر کیا۔ فکری لہروں کی صدائے بازگشت اقبالؔ کے متداول کلام میں بھی سنائی دیتی ہے لیکن اس میں وہ گھن گرج نہیں جو اس کلام میں موجود ہے جسے علاّمہ نے ترک کر دیا تھا۔

نقادوں نے اس امر پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ کسی فنکار کے فن کا صحیح جائزہ اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب ہم اس فنکار کے ذاتی حالات اور شخصیت سے آگاہ ہوں۔ فن پارے کو فنکار سے جُدا کر کے دیکھنے کی کوشش غلط راستوں پر ڈال سکتی ہے۔ کسی اور فنکار کے بارے میں یہ بات درست ہو نہ ہو اقبالؔ کے سلسلے میں بلکل درست ہے۔ اقبالؔ کی بعض دلچسپیاں مشاعروں کے سلسلے میں سفر اور ان کی سوانح حیات کے کئی پہلو اور زاویے متروک کلام میں موجود ہیں۔ اپنے معاصرین سے علاقے کے تعلق پر اس کلام سے بہت روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اس سے حالیؔ، شبلیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد سے اقبالؔ کے روابط کی نوعیت کیا تھی اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد علاّمہ کی نظم ''نالہ یتیم'' سُن کر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''میں نے دبیر اور انیس کی بہت نظمیں سنی ہیں مگر ایسی دل شگاف نظم کبھی

نہیں سنی'' [۱]

اقبالؔ کے قطعات تاریخی اور بعض دیگر نظموں کے واسطے سے ہمیں اقبالؔ کے بعض ایسے احباب کے بارے میں علم ہوتا ہے جن کا ذکر ان کی سوانحی کتابوں میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً محبوب خان حامد، سلطان اسمٰعیل جان، شیخ عبدالحق، سید نادر حسین تحصیلدار بھیرہ، لیڈی شہاب الدین، فقیر اخان جدون اور نادر کاکوردی وغیرہ۔

باقیات کا مطالعہ درج ذیل حوالوں سے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اقبالؔ کی سوانح

اقبالؔ کے باقیات شعر سے ان کی سوانح کی بعض تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً (۱) داغ نے اقبالؔ کو حیدرآباد (دکن) آنے کی باقاعدہ دعوت دی تھی اس کا اشارہ اقبالؔ کے ایک شعر میں ملتا ہے۔

یہی ہے جو شوقِ ملاقاتِ حضرت
تو دیکھیں گے اک بار ملک دکن بھی [۲]

اقبالؔ، انجمن مسلمانان کشمیری کے جلسوں میں سرگرمی سے شریک ہوکر نظمیں پڑھتے ہیں اور بطور سیکریٹری اپنی انتظامی صلاحیتوں کا عمدہ مظاہرہ کرتے

ہیں۔ وزیر نظام سرکشن پرشاد اقبالؔ کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا اظہار بھی ان باقیات سے ہوتا ہے مثلاً یہ شعر

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں [۳]

اقبالؔ نے ایک زمانے میں غزل گوئی ترک کر دی تھی اس کا ثبوت بھی ان کے باقیات سے مل جاتا ہے۔

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لئے

اقبالؔ کی پہلی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ اقبالؔ کا یہ شعر ان کی ناکام ازدواجی زندگی پر عمدہ روشنی ڈالتا ہے۔

ہو گیا اقبالؔ قیدی محفلِ گجرات کا
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیّاد کا [۴]

اقبالؔ کا حسب ذیل یہ شعر اس امر کی تردید کرتا ہے کہ ارشد گورکانی اقبالؔ کے استاد تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ موصوف سے اقبالؔ کے محض دوستانہ مراسم تھے اور وہ کبھی کبھی ارشد کو اپنا کلام سنا کر داد حاصل کرتے تھے۔

ارشد و رافت سے ہوں اقبالؔ خواہانِ داد
آبداری میں ہیں یہ اشعار گوہر کا جواب

متداول کلام کی بہتر تفہیم

باقیاتِ شعر اقبالؔ کا مطالعہ اقبالؔ کے متداول کلام کی تفہیم میں بھی خاصا مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ مثلاً اقبالؔ کے متداول کلیات کے صفحہ ۴۹۰ پر ایک نظم 'جہاد' موجود ہے۔ اس کا ابتدائی عنوان ''بہاالله'' تھا۔ آخری شعر میں اقبالؔ نے ''بہاالله'' کے حوالے سے بھی ایک شعر شامل کیا تھا جو یہ تھا:

میں تو بہا کی نکتہ رسی کا ہوں معترف
جس نے کہا فرنگ سے ترکِ جہاد کر

اگر اس شعر کو متداول کلام کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو نظم کے پس منظر

اور تشریح میں بہت آسانی رہتی ہے۔ اقبالؔ کے شارحین نے اس پس منظر کی غیر موجودگی میں نظم ''جہاد'' کی جو تشریح کی ہے وہ ناقص اور نامکمل ہے اور اقبالؔ کے اصل خیال کی کما حقہ ترجمانی نہیں کرتی۔

علاّمہ کے متروکات کا مطالعہ نظموں کے عنوان کے تناظر میں کیا جائے تو بھی بعض دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔ مثلاً عنوانات میں تبدیلی سے بھی شاعر کا مافی الضمیر سمجھنے میں مدد ملتی ہیں مثلاً علاقے کی نظم ''بلاد اسلامیہ'' کا ابتدائی عنوان سے ''مدینۃ النبیؐ'' تھا۔ نظم کے ابتدائی اشعار بلاد اسلامیہ کے عنوان سے کم اور ''مدینۃ النبیؐ'' کے عنوان سے زیادہ میل کھاتے ہیں۔

اقبالؔ کے متداول کلام میں کئی وجوہ سے بعض اغلاط در آئی ہیں۔ کلامِ اقبالؔ کو اس طرح کی اغلاط سے پاک کرنے کے لئے متروکات کا مطالعہ ایک حد تک ہماری معاونت کرے گا۔ ان اشعار سے کلامِ اقبالؔ کی صحیح فرمانی ترتیب کے تعین میں خاص مدد ملے گی جس سے فکری ادوار کا صحیح تعین کیا جا سکے گا۔ اقبالؔ کا متداول کلام ان کی ابتدائی غزل گوئی کے ضمن میں کم معلومات فراہم کرتا ہے۔ جبکہ باقیات اس کمی کو بہت حد تک پوری کرتے ہیں۔

متداول کلام کی ابتدائی شکل میں قطع و برید سے اقبالؔ نے اپنے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی لیکن بندوں میں مصرعوں کی تعداد میں یکسانیت برقرار نہ رہ سکی ایک ہی نظم کے ایک بند میں سات اشعار ہیں اور

دوسرے میں تین۔شاید اسی بنا پر کلیم الدین احمد کا علاّمہ پر اعتراضات کا جواز میسر آ گیا اور انہوں نے علاّمہ کی بعض نظموں میں فکری ربط اور توازن کی کمی کو خاص طور پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔علاّمہ کے شعری آثار ان الجھنوں کو دور کرتے ہیں اور ہمیں اقبال کے اصل خیالات اور افکار کو سمجھنے کے لئے وسیع تناظر فراہم کرتے ہیں۔

دیگر شعرا کے اثرات

اقبال کے متروک کلام سے اقبالؔ پر دیگر شعرا کے اثرات کا بھی صحیح تناظر میں جائزہ لیا جا سکتا ہے۔مثلاً علاّمہ کی ابتدائی غزلوں میں داغؔ، امیرؔ اور دیگر ہم عصر شعرا کے اثرات موجود ہیں۔غالبؔ اور داغؔ کے اثرات کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کا اثر

لکھتا ہوں شعر دیدۂ خوں بار سے مگر
کاغذ کو رشکِ بابِ گلستاں کیے ہوئے
بوتے ہیں نخلِ آہ کو باغِ جہان میں
ممنونِ آب دیدۂ گریاں کئے ہوئے
(اشکِ خون)

داغؔ کا اثر

یہ جوانی کے ولولے اے دل
دو گھڑی کے اُبال ہوتے ہیں
ذکر کچھ آپ کا بھی ہے ان میں
قبر میں جو سوال ہوتے ہیں

'اکبری' رنگ کے متعدد قطعات ''بانگ درا'' میں شامل نہیں ہو سکے۔ اکبر کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے باقیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

تفضیل علیؓ کے اشعار

حضرت علیؓ سے علامہ کی بے پناہ عقیدت کا اظہار جتنا متروک کلام سے ہوتا ہے اتنا مدون کالم سے نہیں ہوتا، شاید اسی بنا پر ایک زمانے میں علامہ کو تشیع سے منسوب کیا گیا۔ ممکن ہے یہی پہلوان اشعار کو ترک کرنے کا سبب بنا ہو۔ کہتے ہیں:۔

ہمیشہ وردِ زباں ہے علیؓ کا نام اقبالؔ
کہ پیاس رُوح کی بجھتی ہے اس نگینے سے
پوچھتے کیا ہو مذہبِ اقبالؔ
یہ گنہ گار بوترابی ہے

اقبالؔ کی فرض نام سے لکھی گئی نظمیں

باقیات شعر اقبالؔ میں شامل بعض نظموں سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ علامہ نے فرضی نام (ایکس شاعر) سے بھی کچھ نظمیں لکھی تھی۔ یہ نظمیں جن کا عمومی انداز طنزیہ اور مزاحیہ ہے اقبالؔ کی اُس کشمکش کو ظاہر کرتی ہیں کہ ایک طرف تو وہ قائداعظم کے حکم سے یونینسٹ پارٹی کو مسلم لیگ میں ضم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، دوسری طرف اس پارٹی کے بعض لیڈروں کی منافقت کا پردہ بھی چاک کرنا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ کی ان بارہ غیر مدوّن نظموں میں اتحادیوں اور قادیانیوں پر جو چوٹیں کی گئی ہیں متداول کلام میں ان کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔

اقبالؔ کی تاریخ گوئی

علاّمہ کے متداول کلام میں علامہ کی تاریخ گوئی کا کوئی نمونہ شامل نہیں کیا گیا۔ علاّمہ کے ہاں یہ فن داغ اور معاصر شعرا کے مطالعے سے آیا ہے۔ وہ آخر وقت تک تاریخ گوئی نکالنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ نے دوسرے شعرا کی تخلیقات کے نئے اور خوبصورت تراجم بھی کیے ہیں۔ جن سے بعض انگریزی شعرا سے اقبالؔ کی اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کے فن میں ان کی مہارت کا ثبوت ان کی یہی نظمیں ہیں۔ علاّمہ کبھی اصل خیال پر اضافہ کرتے ہیں اور یوں ان کے ہاں ترجمہ تخلیق کا درجہ اختیار کرتا نظر آتا ہے۔

اقبال کی فرمائشی نظمیں

احباب کی فرمائشیں بھی بعض اوقات اقبالؔ کو شعر گوئی پر مجبور کر دیتی تھیں۔ اس طرح کا کلام اقبالؔ کی تاریخ گوئی میں بھی موجود ہے۔ باقیات شعرا اقبالؔ کی بعض دیگر نظمیں بھی اسی قبیل کی ہیں مثلاً نظم ''شکریہ'' اُن کے حیدرآباد کے روابط کی مظہر ہے۔ ''شکریہ انگشتری''، منشی سراج الدین سے علاّمہ کے مخلصانہ تعلقات کی مظہر ہے۔۵ ان متروکات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو بعض اوقات احباب کی فرمائشوں کی تعمیل بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو سر ذوالفقار علی خان کی فرمائش پر وہ ''اشک خون'' لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ 'پنجاب کا خواب'، مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب کی فرمائش پر لکھی جاتی ہے لاٹ صاحب اور ڈائریکٹر کا خیر مقدم بھی اسی قبیل کی نظم ہے۔ ان فرمائشی نظموں میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو انجمن حمایت اسلام کے سٹیج سے سنائی گئی تھیں۔ ان نظموں کا مقصد انجمن کے لئے چندہ فراہم کرنا تھا۔ علامہ کی برجستہ گوئی ''اہل درد'' کے ۲۹ اشعار کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور مولوی عبداللہ بسمل کی فرمائش کو پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔۶

اولیاء اللہ سے عقیدت

اقبالؔ کے مکاتیب کی طرح ان کے شعری باقیات میں بھی اولیاء اللہ

سے عقیدت کے کئی نمونے ہمیں مل جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ سے محبت کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ اپنی ایک ذاتی پریشانی کو رفع کرنے کے لئے خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام ایک نظم لکھتے ہیں اور اسے مزار پر بلند آواز سے پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس نظم کا نام ''برگِ گل'' ہے۔

راگ اور موسیقی سے دلچسپی

اقبالؔ کی میٹرک کی کتابوں میں موسیقی کے بعض سُروں کے بارے میں حوالے ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو راگ اور موسیقی سے خاصی دلچسپی تھی۔ ان کی دلچسپی کا اظہار باقیات کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبالؔ
راگ ہے دین مرا، راگ ہے ایمان میرا

فکری ارتقا کے نمونے

فکری لحاظ سے اقبالؔ نے کن خیالات کو ترک کر دیا؟ اس کا بہترین اظہار اقبالؔ کے باقیات شعری سے ہوتا ہے۔ وطنیت، قومیت، نیز تصوف، وحدت الوجود، قادیانیت اور دو قومی نظریے کے حوالے سے اقبالؔ کے ان اشعار میں ایسا مواد موجود ہے جس سے تحقیق کے لئے گوشے وا ہوتے ہیں۔ مثلاً ان

وجوہات کا علم ہوتا ہے جو ایک زمانے میں اقبالؔ اور قائداعظم میں اختلاف کا موجب تھے۔

اقبال کا فنی ارتقا

ان اشعار سے نہ صرف اقبالؔ کے ذہنی ارتقا کی کڑیاں مرتب ہوسکتی ہیں بلکہ فنی ارتقا کی پوری کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو فن کی بلندیوں پر پہنچانے والی اصل چیز ان کی وہ محنت ہے جو وہ اپنے کلام پر مسلسل کرتے رہتے تھے۔ اقبالؔ کی آفاقیت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے کلام سے ایسے اشعار نکال دیتے ہیں جن میں شخصی اور مقامی پن زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے بیشتر فرمایشی اشعار اپنے کلام میں شامل ہی نہیں کیے اشعار کی تراش خراش اور پھر اس کے انتخاب میں جگر کاوی کے نتیجے میں اقبالؔ کا جو کلام ہمارے سامنے آیا ہے اُس نے جغرافیائی سرحدوں کو پامال کر دیا اور پوری دنیا کے دل کی دھڑکن بن گیا۔

باقیاتِ شعرِ اقبالؔ نہ صرف علامہ کے نظریات کا پس منظر فراہم کرتے ہیں بلکہ عوام کے نظریۂ فن پر بھی کما حقہ روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعر اپنے کلام کا بہترین ناقد نہ سہی لیکن اپنے کلام کے فن اور فکری پہلوؤں پر اس کی اچھی خاصی نظر ہوتی ہے۔ کسی شعر کو ترک کرنے یا اس میں اصلاح کرنے کے عملی پہلو کے پیچھے شاعر کا زبردست تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کو نظریاتی اور فنی

دونوں پہلوؤں سے دیکھتا ہے، پرکھتا ہے۔ شاعر کا شعری ذوق اس مرحلے پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ رد و قبول کی بھٹی سے اپنے کلام کو گذار کر وہ ہمارے سامنے اپنی تخلیق پیش کرتا ہے۔ جتنا بڑا شاعر ہوگا اتنا ہی اس میں تنقیدی شعور بھی زیادہ ہوگا۔ ترمیم و تنسیخ کے عمل کا آغاز عام طور پر اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب کوئی خیال، جذبہ یا واقعہ شاعر کے ذہن میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جو تخلیق اس ارتعاش کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آتی ہے وہ ذہن کے پر اسرار گوشوں سے گذر کر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر تمام تخلیقی عمل کو پوری طرح سمجھ لینا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ لیکن جب کوئی تخلیق زینتِ قرطاس بنتی ہے اور پھر اس کی نوک پلک درست کی جاتی ہے تو یہ تبدیلیاں اس لمحے میں شاعر کی تمام نفسیاتی کیفیتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان اصطلاحات اور تبدیلیوں کا شاعر کے عہد اور ماحول کے پس منظر میں تجزیہ کیا جائے تو بعض اوقات اس فنکار کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ اقبالؔ کے شعری آثار تین طرح کے ہیں:۔

(الف) وہ نظمیں، غزلیں، قطعات و رباعیات جنہیں علامہ نے مختلف وجوہ کی بنا پر ترک کر دیا تھا۔

(ب) جو نظمیں علامہ نے کلام میں اشاعت کے لئے منتخب کی تھیں ان کے بعض اشعار ترک دیے گئے۔

(ج) بعض اشعار میں علامہ نے اصلاحات کی تھیں۔ ان کی بیاضوں کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مصرعے کو دو، دو اور بعض اوقات تین یا چار دفعہ تبدیل کر دیتے ہیں اس سے بھی زیادہ دلچسپ امر یہ ہے کہ بعض مصرعوں میں کی جانے والی تمام اصلاحات علامہ کو پسند نہیں آتیں اور وہ ابتدائی مصرعے کو بحال کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے متعدد اشعار اور مصرعے اب علامہ کے متداول کلام میں موجود ہیں۔ کلامِ اقبالؔ کے اس حصے کی نشاندہی ہونی چاہئے تا کہ ایسے اشعار کی تفہیم وتشریح میں اس پہلو کو سامنے رکھا جا سکے کہ اقبالؔ فنی یا فکری لحاظ سے ان اشعار سے مطمئن نہیں تھے۔ عدم اطمینان کا یہ فنی یا نفسیاتی تجزیہ اقبال کے بارے میں ہماری معلومات میں ضرور اضافہ کرے گا۔

اقبالؔ کی اپنے کلام پر اصلاح عام طور پر ان کے شعر کو معیاری بنا دیتی ہے۔ ۷ اس سے علامہ کے تنقیدی شعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اصلاح کا یہ عمل بانگِ درا سے ارمغان حجاز تک اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ ۸ علامہ کے متروکات و اصلاحات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو شعر کے فنی پہلوؤں سے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ فنِ شاعری سے ناواقفیت کا اظہار جس کا ذکر ان کے کئی خطوں میں ہوا ہے، محض انکسار ہے۔ علامہ کے متروکات اور اصلاحات کا مطالعہ ان کے متداول کلام کو سمجھنے میں ہماری بہت معاونت کر سکتا ہے۔

علامہ کی اصلاحات

اقبالؔ کے ہاں کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کا عمل لمحہ تخلیق سے مجموعے کی اشاعت تک جاری رہتا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کے نام خط میں اگر چہ علامہ اپنے آپ کو فنِ اصلاح سے نابلد قرار دیتے ہیں۔[۹] لیکن یہ محض ان کا انکسار ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس فن کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں علامہ نے اورنگ زیب عالمگیر کی قبر کی زیارت کی اور ایک نظم لکھی اس نظم کا ایک مصرع یوں تھا۔

ترکشِ مارا خدنگ آخریں

علامہ نے اس بے نظیر مصرعے کے بارے میں دین محمد مرحوم (سابق گورنر سندھ) سے کہا کہ انہوں نے اس مصرعے پر چالیس بار نظر ثانی کی تھی تب موجودہ صورت میں یہ مصرع سامنے آیا علامہ کی بیاضیں اور مسودات اس امر کے گواہ ہیں کہ ایک ایک مصرعے کو تین تین اور بعض اوقات چار چار دفعہ تبدیل کیا۔ اصلاحات کا یہ عمل اُس وقت بھی جاری رہتا تھا جب آپ مسودہ کاتب کے حوالے کر دیتے تھے۔ آج جو اشعار زبان ردِ خاص و عام ہیں، اس جگر کاوی کے نتیجے ہی میں انہوں نے موجودہ صورت اختیار کی ہے چند مثالیں۔

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو

کا دوسرا مصرع ابتدا میں یوں تھا۔

باقی ہیں کچھ آثار ملوکی کے مٹادو

اسی طرح

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

کا یہ شعر ابتدا میں یوں تھا لیکن وزن درست نہ ہونے کی وجہ سے اسے تبدیل کر دیا۔

محبت مجھے آفریدیوں سے ہے
کہ ہے آسمان گیر ان کی کمند

مختلف ادوار میں علامہ کی اصلاحات کا معیار تقریباً یکساں رہا ہے۔ خوب سے خوب تر کی سعی اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جاری رہی ہے۔ تاہم ابتدائی اصلاحات میں فنی نزاکتوں اور لفظی آرائش کا خیال کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ الفاظ کے صحیح انتخاب اور علم بیان کے وسیع تر علم کی بدولت اشعار میں تمثال آفرینی کی کیفیت پیدا کرنے کا شعوری رجحان نمایاں رہا ہے۔ جبکہ آخری دور کی اصلاحات میں کفایت لفظی سے کام لینے اور رمزیت وطنزیہ لطافت پیدا کرنے کا انداز اظہار کے دوسرے وسیلوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اسلوبِ بیان کی یہ تمام تر نزاکتیں فن کے متعلق اقبال کے اس انکسار کو ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں شاعری سے

کوئی دلچسپی نہیں اور یہ کہ ان کے اعلیٰ مقاصد فنِ شاعری پر غالب رہتے ہیں۔ ان اصلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کو فنِ شاعری پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ فصاحت و بلاغت کے تمام رموز سے آشنا تھے، اور انہیں برتنے کا سلیقہ بھی جانتے تھے۔ مزید برآں انہیں لفظ و معنی کے رشتے کا بھی علم تھا اور تاثیرِ شعری میں ہر دو کی ترکیب امتزاجی کا بھی وافر شعور تھا۔ اصلاحات کے ضمن میں علامہ کی جگر کاوی ہی نے انہیں ممتاز شعراء کی صف میں شامل کیا اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہ اصلاح شعر پر اتنی محنت نہ کرتے تو ان کی مقصدی شاعری تاثیر کے اس وصف سے محروم رہتی جو آج اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

علامہ کی تاثیرِ شعری کا راز جاننے کے لئے باقیات شعرِ اقبال کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس امر کی ضرورت بھی اب شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ اقبال کی اصلاحات جمع کر کے ان کے نظریہ فن اور ردّ و قبول کا صحیح معیار متعین کیا جائے۔

باقیات شعری کا انتخاب

باقیات شعرِ اقبال (اردو) کسی طور اقبال کے کلام کے متداول مجموعے ''کلیات اقبال'' (اردو) کا بدل نہیں ہے۔ چونکہ اس مجموعے کا بیشتر کلام اقبال کی شعوری کوشش کے نتیجے میں ترک کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کلام کو ہم اقبال کے فکر و فن کے مثال کے طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ اس کلام کو نصاب میں بھی اس لئے

شامل کرنا مناسب نہیں کہ اقبالؔ نے اسے ردّ کر دیا تھا۔ تاہم اقبالؔ کے فکری اور فنی ارتقا کی مختلف کڑیوں کو ملانے کے لئے اس کلام سے استفادہ ناگزیر ہے۔ اس کے باوجود راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر ماہرین اقبالیات کا ایک بورڈ اس مقصد کے لئے تشکیل دیا جائے تو باقیات کے اس ذخیرے سے ایسا کلام منتخب کیا جاسکتا ہے جو فکری اور فنی دونوں پہلوؤں سے اقبالؔ کے متداول کلام کے ہم پلہ ہو۔ ذیل میں ہم محض نمونے کے طور پر ایسے اشعار کا انتخاب پیش کر رہے ہیں جو کسی لحاظ سے اقبالؔ کے معروف کلام سے کم نہیں ہے۔

ہر گھڑی اے دل نہ یوں اشکوں کا دریا چاہئے
داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہئے

آج ہم حالِ دل درد آشنا کہنے کو ہیں
اس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا

ہوں کبھی اس شاخ پر میں اور کبھی اُس شاخ پر
ناک میں آخر کو دم آیا مرے صیّاد کا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

حسرت نہیں کسی کی تمنّا نہیں ہوں میں
مجھ کو نکالئے گا ذرا دیکھ بھال کے

ہائے کس ناز سے آیا ہے خیالِ جاناں
چمنِ دل میں مرے بادِ بہاری آئی

ذکر کچھ آپ کا بھی ہے ان میں
قبر میں جو سوال ہوتے ہیں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سرکو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

میں نخل ہوں وفا کا محبت ہے پھل مرا
اس قول پر ہے شاہدِ عادل عمل مرا

ہے خبر تاروں میں لیکن آمدِ خورشید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

فضا اک اور ہی عالم کی ہوگی سامنے میرے
مگر ڈر ہے کہ یہ بھی پردۂ محمل نہ بن جائے

نظر آئی نہ مجھ کو بو علی سینا کے دفتر میں
وہ حکمت جو کبوتر کو کرے شاہیں سے بے پروا
علم کے زخم خوردہ کو علم سے، بے نیاز کر
عقل کو مے گسار کر، عشق کو نے نواز کر

صورتِ ریگ بادیہ مرے غموں کا کیا حساب
درد کی داستان نہ پوچھ دستِ کرم دراز کر

شہید جستجو ہے فکرِ انساں بزم ہستی میں
یہ کس الجھی ہوئی گتھی کے سلجھانے کی باتیں ہیں

ہے سوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

باقیات شعرا اقبالؔ کے مآخذ

اقبال کی پہلی غزل ستمبر ۱۸۹۳ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ جبکہ اقبالؔ کی شاعری کی اصل شہرت کا آغاز انجمن حمایت اسلام کے جلسوں سے ہوا۔ نالۂ یتیم انجمن کے جلسے میں ۱۹۰۰ء میں سنائی گئی پھر اپریل ۱۹۰۱ء میں نظم ''ہمالہ'' لکھی گئی جو ''مخزن'' کے پہلے شمارے اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ستمبر ۱۹۰۷ء سے پہلے اقبالؔ کا بہت سا کلام کشمیری میگزین، کشمیری گزٹ، وطن اخبار، پیسہ اخبار، مخزن، زمانہ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا لیکن بہت سا کلام اقبالؔ محفوظ نہ کر سکے، ستمبر ۱۹۰۷ء کے بعد اقبالؔ نے اپنے کلام کو بیاضوں میں محفوظ کرنا شروع کیا یورپ

سے واپسی کے بعد اقبالؔ اسرارِ خودی اور پھر رموز بے خودی کی تصنیف میں مصروف ہوگئے اور اپنے اردو مجموعہ کلام کی اشاعت کا خیال نہ آیا۔ ۱۹۱۹ء کے بعد ان کے احباب نے بھی اقبالؔ کی توجہ اردو مجموعہ کلام کی جانب مبذول کرانا شروع کردی۔ ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی نے مجموعے کی اشاعت کے بارے میں اقبالؔ کو خط لکھا۔ ۱۹۲۱ء میں علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز نے اپنے دوست مشتاق صاحب کی سفارش کرتے ہوئے اقبالؔ کے کلام کی اشاعت کی اجازت مانگی لیکن علامہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کردیا اور یہ عذر پیش کیا کہ وہ خود ایک مجموعہ مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔[۱۰]

۱۹۲۳ء میں اقبالؔ نے اردو کلام کی تدوین کا آغاز کردیا۔ اسی دوران میں اقبالؔ کے دوست احمد دین نے اقبالؔ سے مشورہ کیے بغیر اور انہیں حیرت میں ڈالنے کی غرض سے کتاب ''اقبال'' شائع کردی جس میں اقبالؔ کی غزلیں اور نظمیں شائع کردیں۔ اقبالؔ اس پر ناراض ہوئے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کی شاعری انتخاب اور اصلاح نیز نظر ثانی کے بغیر دوبارہ شائع نہیں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ احمد دین نے یہ مجموعہ نذر آتش کردیا۔ تاہم اس کے ایک دو نسخے کسی طرح محفوظ رہ گئے۔ ۱۹۲۳ء میں ہی حیدرآباد (دکن) سے مولوی عبدالرزاق نے اخبارات و رسائل سے کلام حاصل کر کے کلیات اقبالؔ چھاپ دیا:۔ یہ امر بھی اقبالؔ کو ناگوار گذرا چنانچہ اس مجموعہ کی فروخت کو حیدرآباد کی ریاست تک محدود کر

دیا گیا۔ چودہری محمد حسین کی ڈائری ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبالؔ کا انتخاب اور اصلاح کا عمل عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین کی معاونت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یوں بانگ درا منظر عام پر آئی۔ کلام کی فراہمی کے لئے بعض احباب کی بیاضوں سے مدد لی گئی۔ یقیناً شائع شدہ کلام کا کچھ حصہ اقبالؔ کی دسترس سے باہر رہا ہوگا۔ لہٰذا انتخاب کے عمل سے نہ گذر سکا۔

بانگِ درا جب شائع ہوئی تو اس دور کا ۵۵ فیصد کلام متروک قرار دے دیا گیا۔ اس متروک کلام میں ۵ سے ۱۰ فیصد کلام ایسا بھی شامل ہوگا جو اقبالؔ کے سامنے موجود نہ تھا۔ اگر یہ تمام کلام شائع ہو جاتا تو بانگِ درا کی ضخامت ۶۰۰ صفحات تک پہنچ سکتی تھی لہٰذا کڑے انتخاب کے بعد، اس مجموعے کو پونے تین سو صفحات تک محدود کر دیا گیا۔ جو کلام بچ گیا اس کی بنیاد پر کئی مجموعے شائع ہوئے۔ اقبالؔ کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اعجاز احمد کی بیاض میں شامل تھا جسے 'روزگار فقیر'' جلد دوم میں شامل کیا گیا۔ یوں باقیات کے نصف درجن مجموعے سامنے آئے۔

راقم الحروف نے ان تمام مجموعوں کے علاوہ اقبالؔ کی بیاضوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اخبارات و رسائل کی مزید ورق گردانی، نیز مکاتیب اقبالؔ کے ذخیرے کو کھنگالنے کے بعد کچھ غیر مدون کلام اور غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا۔ بعض احباب نے بطور خاص باقیات کلام اقبالؔ کی دریافتوں کا سلسلہ جاری رکھا

اور متعدد رسائل میں اقبالؔ کے شعری باقیات شائع کرائے ''کلیات باقیاتِ شعر اقبالؔ'' کا ماخذ یہی ہے جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

مستقل مجموعے

۱)	رخت سفر مرتبہ انور حارث	طبع اول ۱۹۵۲ء
۲)	رخت سفر مرتبہ انور حارث	طبع دوم ۱۹۷۷ء
۳)	باقیات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی	طبع اوّل ۱۹۵۳ء
۴)	باقیات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی	طبع سوم ۱۹۷۷ء
۵)	سرودِ رفتہ، غلام رسول مہرؔ	۱۹۵۹ء
۶)	تبرکاتِ اقبالؔ محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی	۱۹۵۹ء
۷)	نوادرِ اقبالؔ عبدالغفار شکیل	۱۹۶۲ء
۸)	روزگارِ فقیر از فقیر وحیدالدین	۱۹۷۰ء
۹)	ابتدائی کلام اقبالؔ از گیان چند	۱۹۸۸ء

جزوی مجموعے

۱)	اردو کی چھٹی کتاب	۱۹۰۴ء
۲)	اردو کی پانچویں کتاب	۱۹۰۵ء
۳)	A Voice from the East	
	نواب سر ذوالفقار علی خان	۱۹۲۲ء

۴) اقبال از احمد دین پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء

۵) کلیات اقبال (حیدر آباد) مرتبہ مولوی عبدالرزاق ۱۹۲۴ء

۶) سپاس جناب امیر اور دیگر نظمیں مرتبہ تصدق حسین تاج ۱۹۳۸ء

۷) جہانِ اقبالؔ مرتبہ عبدالرحمٰن طاری ۱۹۴۷ء

۸) اصلاحاتِ اقبالؔ مرتبہ بشیر الحق دسنوی ۱۹۵۰ء

۹) تنقیدیں اور خاکے۔ جلیل احمد قدوائی ۱۹۵۲ء

۱۰) ذکرِ اقبالؔ مرتبہ عبدالمجید سالک ۱۹۵۵ء

۱۱) اوراق گم گشتہ مرتبہ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ۱۹۷۵ء

۱۲) تلاش و تاثر۔ عبدالحق دسنوی ۱۹۷۶ء

۱۳) اقبالؔ اور انجمن حمایت اسلام۔ حنیف شاہد ۱۹۷۶ء

۱۴) روایاتِ اقبالؔ۔ عبداللہ چغتائی ۱۹۷۷ء

۱۵) اقبالؔ کی صحبت میں۔ عبداللہ چغتائی ۱۹۷۷ء

۱۶) اقبالؔ انیسویں صدی میں ۱۹۷۷ء

۱۷) کلام اقبال (نادر و نایاب رسائل کے آئینے میں) اکبر حیدری ۲۰۰۱ء

ان مآخذ کے علاوہ راقم الحروف نے درج ذیل مآخذ سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔

علامہ کی بیاضیں

۱) بیاضِ بانگ درا (جلد اول، دوم، سوم، چہارم)

۲) بیاضِ بال جبریل (پنجم)

۳) بیاضِ بال جبریل (ششم)

۴) بیاضِ ضرب کلیم (ہفتم)

۵) بیاضِ ارمغان حجاز (ہشتم)

علامہ کے مسودے

۱) مسودہ بال جبریل

۲) مسودہ ضرب کلیم

دیگر قلمی نسخے

۱) بیاضِ شیخ اعجاز احمد

۲) بیاضِ صادق حسین لاہور

۳) بیاضِ حاجی علی گوہر خان مانسہرہ

۴) بیاضِ عماد الملک ومحمد انور خان بحوالہ گیان چند

قلمی ڈائریاں

۱) عبداللہ المتخلص ابتر وافضل: حضرو اٹک

۲) منشی محمد دین فوقؔ مملوکہ عبداللہ قریشی

۳) میاں عبدالرشید سمن آباد لاہور

۴) کریم بی بی سیالکوٹ

تحقیقی مقالہ

۱) چودھری محمد حسین اور علامہ اقبالؔ (روابط) از ثاقف نفیس
اورینٹل کالج، لاہور

رودادیں

۱) انجمن حمایت اسلام لاہور کی متعدد رودادیں

رسائل واخبارات

مخزن، صوفی، پیسہ اخبار، اخبار کشمیری، انقلاب، زمیندار، پنجہ فولاد، وطن اخبار، کشمیری گزٹ، تمدن، جامعہ، حمایت اسلام، شاہکار، زبان دہلی، صبا حیدرآباد (دکن)، عالمگیر، علی گڑھ میگزین، فردوس (لاہور) فصیح الملک، ماہ نو، معارف، مہر نیم روز، نظام المشائخ، نگار (لکھنؤ)، نیرنگ خیال، ہمایوں، ہم قلم، طلوع اسلام، شگوفہ حیدرآباد، اقبالؔ ریویو، اقبالؔ، اقبالیات، صحیفہ وغیرہ

مضامین

اس کے علاوہ درج ذیل مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا جن میں نظموں

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 – 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے ۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے با آسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک:

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

اور غزلوں کے کئی اشعار شائع ہوئے:

۱) علامہ اقبالؔ کا غیر مطبوعہ کلام نظیر لدھیانوی
شاہکار، لاہور مارچ ۱۹۴۶ء

۲) علامہ اقبالؔ کا غیر مطبوعہ کلام نظیر لدھیانوی
ہمایوں، لاہور اپریل ۱۹۵۰ء

۳) اصلاحات اقبالؔ کیپٹن منظور حسین
امروز اپریل ۱۹۵۸ء

۴) اقبال کی تین نظمیں عبدالقوی دسنوی
مہر نیمروز جون۔اگست ۱۹۵۸ء

۵) نوادرات اقبالؔ اکبر علی خان
صحیفہ شمارہ ۹ جون۔اگست ۱۹۵۸ء

۶) گنج بادآورد اکبر علی خان
صحیفہ شمارہ ۱۱ دسمبر۔جنوری ۱۹۵۸ء

۷) اقبالؔ کے چند نوادر اکبر علی خان
ماہ نو، اقبال نمبر ۷۷ اپریل ۱۹۵۹ء

۸) نوادرِ اقبالؔ اکبر علی خان
صحیفہ شمارہ ۱۳ ۱۹۶۰ء

۹) ایک جوئے کہستان کی موجِ رواں

صبا حیدرآباد دکن مارچ ۱۹۶۱ء

۱۰) ایک جوئے کہستان کی موجِ رواں عابد رضا بیدار

ماہ نو اقبال نمبر ۷۷ اپریل ۱۹۶۲ء

۱۱) چند نوادر بسلسلہ اقبالیات اکبر علی خان

اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۲ء

۱۲) ایک جوئے کہستان کی موجِ رواں عابد رضا بیدار

ہم قلم کراچی دسمبر ۱۹۶۲ء

۱۳) تحقیقی مسائل (اقبالیات کے چند غیر مرتب نوادر) جلیل قدوائی

ہم قلم کراچی جنوری ۱۹۶۲ء

۱۴) چند نوادر بسلسلہ اقبالیات اکبر علی خان

اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۲ء

۱۵) خدنگِ خجستہ رئیس مینائی

ماہِ نو اقبال نمبر ۷۷ اپریل ۱۹۶۴ء

۱۶) اقبال کی ایک فراموش شدہ نظم شمع ہستی لطیف اللہ بدوی

اقبال ریویو ستمبر ۱۹۶۵ء

۱۷) اقبالیات — عبدالقوی دسنوی
جامعہ جولائی دسمبر ۱۹۶۶ء

۱۸) اقبالؔ کی ایک نادر تحریر — کامل القادری
افکار خاص نمبر اپریل مئی ۱۹۶۹ء

۱۹) اقبالؔ پر نیا مواد — بشیر احمد ڈار
اقبالؔ ریویو جنوری ۱۹۷۰ء

۲۰) نادرات اقبالؔ — افضل حق قریشی
صحیفہ اقبال نمبر ۱۹۷۳ء

۲۱) اقبالؔ کا غیر مطبوعہ کلام — ادارہ
مہک اقبال نمبر ۷۵۔ ۱۹۷۴ء

۲۲) نوادرِ اقبالؔ — اختر راہی
اقبالؔ اکتوبر ۱۹۷۶ء

۲۳) اقبالؔ کا غیر مطبوعہ کلام — اصغر حسین نظیر
برگ گل اقبالؔ نمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء

۲۴) باقیاتِ اقبالؔ — قاضی افضل حق قریشی
رسالہ اردو، طبع جدید ۱۹۷۷ء

۲۵) غیر مدون کلام ادارہ

مہک گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ۱۹۷۷ء

۲۶) ایک قطعہ تاریخ ڈاکٹر عبدالغنی

صحیفہ اپریل ۱۹۷۷ء

۲۷) باقیاتِ اقبال حنیف شاہد

صحیفہ جولائی ۱۹۷۸ء

۲۸) بال جبریل کا متروک کلام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مجلہ تحقیق شمارہ ۴ ۱۹۸۰ء

۲۹) علامہ اقبال کا کچھ غیر مطبوعہ کلام

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اورنٹل کالج میگزین مارچ ۱۹۸۲ء

۳۰) علامہ اقبال کا غیر مطبوعہ کلام سید سرفراز احمد

مشرق اقبال نمبر اپریل ۱۹۸۳ء

۳۱) علامہ اقبال اور درسی کتابیں ڈاکٹر حسن اختر

ماہ نو اپریل ۱۹۸۳ء

۳۲) علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ قطعات نظیر لدھیانوی

امروز اقبال ایڈیشن نومبر ۱۹۸۳ء

۳۳) اقبالؔ کا ایک غیر مطبوعہ سہرا پروفیسر ریاض حسین

اقبالیات جولائی۔ستمبر ۱۹۹۲ء

۳۴) نوادرِ شعرِ اقبالؔ افضل حق قریشی

اقبالیات جولائی ۱۹۹۶ء

۳۵) علامہ اقبال کا ایک نایاب قطعہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن

ماہِ نو اقبال نمبر نومبر ۲۰۰۲ء

باقیات کی تدوین نو کے مسائل

باقیات شعرِ اقبالؔ کی تدوین نو کے ضمن میں ہمیں جو مسائل در پیش رہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆ اقبالؔ کا کلام ان کی زندگی میں جن رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتا رہا، ان میں سے بعض دستیاب نہیں۔

☆ باقیاتِ شعرِ اقبالؔ کے جو مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں اپنے مآخذ کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے چنانچہ بعض اوقات یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نے کہاں سے یہ کلام اخذ کیا؟

☆ نقل در نقل کی وجہ سے اختلاف متن کی متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں، جن متون کے بنیادی مآخذ دستیاب نہیں، ان کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ اقبالؔ کی قلمی بیاضیں اس ضمن میں ہماری بہت الجھنوں کو رفع کر سکتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی بیاضوں میں ۱۹۰۷ء سے پہلے کا کلام موجود نہیں۔ کہیں کہیں اقبالؔ کا سوادِ خط بھی الجھن کا سبب بنتا ہے۔

☆ اقبال نے جن احباب کی بیاضوں کی بنیاد پر بانگِ درا کا کلام منتخب کیا تھا وہ اب دستیاب نہیں۔

☆ اقبالؔ کے باقیاتِ شعری کا زمانۂ تصنیف معلوم کرنا مزید مشکلات کا سبب بنتا ہے۔

☆ باقیات کے ذخیرے میں کچھ الحاقی کلام بھی شامل ہو گیا ہے جسے بوجوہ غلط طور پر اقبالؔ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

☆ باقیاتِ شعرِ اقبالؔ کے نصف درجن کے قریب مجموعوں میں مشترک کلام بھی پایا جاتا ہے اور ایسا کوئی مجموعہ موجود نہیں ہے جو اس عیب سے پاک ہو اور جامع بھی ہو۔

☆ بعض مجموعوں مثلاً: ''باقیاتِ اقبالؔ'' اور ''روزگارِ فقیر'' میں ایسے اشعار بھی شامل کر لئے گئے ہیں جو باقیات کی ذیل میں نہیں آتے بلکہ متداول کلام میں موجود ہیں۔

☆ مکاتیب اقبالؔ نیز سوانح اقبالؔ کی بعض کتب میں اکا دُکا اشعار موجود ہیں جنہیں باقیات کے جامعین نے مدوّن نہیں کیا۔

ان مسائل کو درج ذیل طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

☆ اقبالؔ کے متداول اور غیر متداول کلام کے تمام مآخذ کا ایک اشاریہ مرتب کیا گیا اور ان تمام مآخذ کا بدقتِ نظر مطالعہ اور موازنہ کیا گیا۔ ان متون کو اقبالؔ کی بیاضوں سے بھی ملا کر دیکھا گیا۔

☆ متن کے بیشتر اختلاف حقیقی نہیں تھے بلکہ نقل در نقل کے نتیجے میں پیدا ہو گئے تھے۔ ایسے اختلافات کو درخورِ اعتنا نہیں جانا گیا۔ صرف انہی اختلافات کا ذکر کیا گیا جس کی کوئی اور تاویل ممکن نہیں تھی۔

☆ کلام اقبال کی جملہ اوّلین اشاعتوں کو حاصل کیا گیا اور کچھ قلمی بیاضوں سے بھی مدد لی گئی۔

☆ نظموں کے زمانۂ تصنیف کا تعین کرنے کے لئے اقبالؔ کے خطوط اور ان کے احباب کی یاداشتوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔

☆ خوش قسمتی سے اقبالؔ کی بیاضوں میں بعض نظموں کا زمانۂ تحریر درج ہے جہاں راست تاریخ یا مہینہ نہیں مل سکا، وہاں نظم کی اوّلین اشاعت کی تاریخ یا مہینے کو زمانۂ تصنیف قرار دیا گیا۔ اس ضمن میں بعض داخلی اور خارجی شہادتوں کی بدولت بھی زمانے کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یوں یہ کلیات بڑی حد تک زمانی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔

☆ اقبالؔ کے الحاقی کلام کا سراغ لگایا گیا ہے اور ان اشعار کو کلیات سے خارج کر دیا گیا۔

☆ جس کلام کی صحت کا پورا یقین نہ تھا اُسے مشکوک سمجھتے ہوئے تحقیق طلب کلام کے عنوان کے تحت شامل کیا گیا۔ تا کہ دیگر محققین اس کے بارے میں مزید تحقیق کر کے صحیح فیصلہ کر سکیں۔

☆ زیرِ نظر مجموعے میں تمام مشترکات کو الگ کر دیا گیا ہے۔ اور اس امر کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ اقبالؔ کے متداول کلام کا کوئی شعر باقیات کے اس مجموعے میں شامل نہ ہو۔

☆ اقبالؔ کی سوانح عمریوں اور معاصرین کی یادداشتوں کو پوری کھنگال لیا گیا ہے اور ہر اُس شعر کو اس مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے جو باقیات کی ذیل میں آتا ہے۔

☆ اقبالؔ کے اوّلین مآخذ کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اگر کسی غزل یا نظم کا اوّلین متن دستیاب نہیں ہو سکا تو اس متن کو ترجیح دی گئی ہے جو دوسرے مآخذ کی نسبت زیادہ مقدم ہو۔

☆ اقبال کی بیاضوں کو مطبوعہ مواد پر ترجیح دی گئی ہے۔ شیخ اعجاز احمد کی مرتب کردہ بیاض سے اہم مآخذ کی حیثیت سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کی خصوصیات

اقبالؔ کے جملہ باقیاتِ شعر کو زمانی ترتیب سے مدوّن کر دیا گیا ہے اس سے اقبالؔ کے ذہنی ارتقا کی پوری کیفیت ہمارے سامنے آجاتی ہے اس ضمن میں تین ادوار بنائے گئے ہیں۔

بانگ درا کے متروکات:

دوراوّل ابتدا تا ۱۹۰۸ء

دوردوم ۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۴ء (بانگ درا کی اشاعت تک)

بال جبریل کے متروکات۔ضرب کلیم + ارمغان حجاز

دورسوم: ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک

ہر دور میں کلام کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے۔

۱) نظمیں:

- مکمل نظمیں (متروکہ)
- متداول کلام کی نظموں کے جزوی متروکات

۲) غزلیں:

- مکمل غزلیں (متروکہ)
- غزلوں کے جزوی متروکات (متداول کلام)

۳) ظریفانہ کلام:

۴) قطعات و رباعیات:

- قطعات
- رباعیات

۵) متفرقات:

(۱) تاریخیں اور مادہ ہائے تاریخ

(۲) بدیہہ گوئی / فردیات

متفرقات کی ترتیب بھی بڑی حد تک زمانی ہے۔ ہر شعبے میں نظموں کی ترتیب کو بھی ممکن حد تک زمانی رکھا گیا ہے۔

☆ اختلاف متن، نظم کا پس منظر اور اس کے مآخذ کے بارے میں تفصیلات چونکہ میرے تحقیقی مقالے میں شامل ہیں لہٰذا انہیں کلیات میں شامل نہیں کیا گیا۔ ویسے بھی عام قارئین کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی چنانچہ اس ضمن میں میرے مقالے کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہئیے جو امید ہے، جلد منصۂ شہود پر آ جائے گا۔

☆ اس کلیات میں ہر نظم کے مآخذ کی سند بھی فراہم کی گئی ہے۔

☆ جو متن اس کلیات میں شامل کیا گیا ہے جو ممکن حد تک اصل کے مطابق ہے۔ دو یا دو سے زیادہ متون کی موجودگی میں کسی ایک متن کو اختیار کرنے کے ضمن میں تدوینِ متن کے اصولوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس امر کی

وضاحت اور صحیح متن کی اسناد تحقیقی مقالے میں فراہم کر دی گئی ہیں۔ جسے کلیات کا تتمہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

☆ زیر نظر مجموعے میں شامل اشعار کا، متداول کلام سے مقابلہ و موازنہ کرنے سے درج ذیل کیفیت سامنے آتی ہے۔

متداول کلام میں اشعار کی کل تعداد: ۴۶۹۷ (مشمولہ: کلیات اقبال اردو)

مدوّن متروکہ کلام اشعار کل تعداد: ۲۷۷۶ (باقیات کے مجموعوں میں شامل کلام)

غیر مدوّن / غیر مطبوعہ کلام ۷۵۰

اقبالؔ کے کل اردو اشعار ۸۲۲۳

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اقبالؔ نے اپنا ۴۲ فیصد کلام متروک قرار دے دیا تھا یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ باقیات میں غیر مدوّن اور غیر مطبوعہ کلام کی ذیل میں ۷۵۰ اشعار کا اضافہ، راقم الحروف کی کوششوں کا حاصل ہے اور اس ضمن میں راقم الحروف کا سب سے اہم مآخذ اقبالؔ کی وہ قلمی بیاضیں ہیں جن کی نقول اب میرے ذخیرہ کتب میں شامل ہیں۔ مزید باقیات کی دستیابی کا امکان اب بہت کم رہ گیا ہے اور نہ اقبالؔ کے خاندانی ریکارڈ سے کسی اضافے کی گنجایش ممکن ہے۔ اس ضمن میں حال ہی میں منظر عام پر آنے والی جاوید اقبالؔ کی خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' کا ایک اقتباس کافی ہوگا:

ایک بار میں نے دیکھا کہ والد (علامہ اقبالؔ) نے اپنے کمرے میں منشی طاہر الدین کے سامنے کاغذوں سے بھرا ایک ٹرنک رکھوایا اور اس میں سے خود چھانٹ کر بعض تصاویر اور کاغذات انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ میں پھینکنے کو دئے۔ وہ تصاویر اور کاغذات ان کے سامنے جلا دئے گئے۔ جو کاغذات یا مسودات بچ گئے اور اب اقبالؔ میوزیم کی زینت ہیں میرے والد کے ذاتی کاغذات میں سے وہی ہیں جو انہوں نے بذاتِ خود محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے۔ ۱۲

راقم الحروف نے اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۸۸ء میں مکمل کر لیا تھا جس پر ۱۹۹۰ء میں ڈگری دی گئی۔ اس کے بعد اقبالؔ کے جو باقیاتِ شعر منظر عام پر آئے۔ انہیں بھی اس کلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں راقم الحروف افضل حق قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری (بھارت) کی مساعی کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ باقیات شعر کے زیرِ نظر اس ذخیرے میں مزید اضافہ ممکن نہیں وقت کے ساتھ ساتھ ممکن ہے کچھ نئے مآخذ ہمارے سامنے آتے جائیں اور اس طرح باقیات شعر اقبالؔ کا یہ ذخیرہ، مزید باثروت ہوتا چلا جائے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

صائمہ رفعت

اقبال شناسی میں بھوپال کا حصّہ

علامہ اقبال کے کلام اور فکر وفن پر بے شمار مضامین اور کتب شائع ہو چکی ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اقبالؔ کی شخصیت اور کلام میں اتنا تنوع، اتنی ہمہ گیری اور اتنی وسعت ہے کہ وہ ہمیشہ فکر و تلاش کے باب وا کرتا رہتا ہے۔

بھوپال کو علامہ اقبالؔ سے جو نسبتِ خاص رہی ہے اس نے اس شہر غزل کو صحیح معنوں میں دارالاقبالؔ کہلائے جانے کا مستحق بنا دیا ہے۔ اقبالؔ اور بھوپال کے تعلق پر کئی کتب اور مضامین لکھے جا چکے ہیں جس میں بطور خاص ''اقبالؔ اور بھوپال'' کا ذکر ناگزیر ہے لیکن اس کتاب کی اشاعت کو ۲۴ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی بھوپال میں اقبالؔ شناسی کے سلسلے میں مسلسل کام ہوتا رہا۔ بھوپال میں علامہ اقبالؔ ادبی مرکز کا قیام، متعدد سمی ناروں کا انعقاد جو مدھیہ پردیش اردو اکادیمی اور کُل ہند علامہ اقبالؔ ادبی مرکز کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے اور ان سمی ناروں میں پڑھے جانے والے مقالات کے مجموعوں کی کتابی شکل میں

اشاعت اور مقتدر اور اقبالؔ فہم اہلِ قلم حضرات کے اس موضوع پر بصیرت افروز مضامین کی یکجائی نے علامہ اقبالؔ کے بھوپال سے براہ راست تعلق اور اس خوبصورت اور عظیم ترین رشتے کی تابندگی اور درخشندگی کو ماند نہیں ہونے دیا۔

ذاتی طور پر مجھے شعوری زندگی کی ابتدا سے علامہ اقبالؔ سے ایک خاص اُنس رہا ہے میں نے ابتدائی تعلیم ''دارالحسنات بھوپال'' میں حاصل کی۔ وہاں کلاس کی شروعات ''لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری'' سے ہوتی تھی جسے ہم سب بچیاں ایک خاص اور پُر درلحن سے پڑھا کرتی تھیں۔ میں نے ایک دن اپنی ٹیچر سے پوچھا تھا کہ ''اسے کس شاعر نے لکھا ہے'' اُنہوں نے مجھے علامہ اقبالؔ کا نام بتایا۔ یہ میری اقبالؔ شناسی کی ابتدا تھی۔ بعد میں جیسے جیسے تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اقبالؔ سے شناسائی اور عقیدت بھی بڑھتی گئی جس ماحول میں، میں نے آنکھ کھولی وہ کافی ادبی تھا۔ اپنے گھر میں اپنے آس پاس سیکڑوں کتب ورسائل کو موجود پایا۔ میرے والد اور والدہ دونوں ہی ادب دوست ہیں۔ والد ڈاکٹر رفعت محمد خاں سیفیہ کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ خود انھوں نے منٹو کی افسانہ نگاری کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل اپنا مقالہ پروفیسر آفاق احمد کی نگرانی میں لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

جب میں نے ایم۔ اے کرنے کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے داخلہ لینا چاہا تو اقبالؔ کی عقیدت نے تقاضا کیا کہ ان کو موضوع بنانے کی

سعادت حاصل کی جائے۔آفاق صاحب نے جن سے میں نے ایم۔ایل۔بی کالج میں ۵ برسوں تک کسب علم کیا تھا اور جن کی نوازشات ہمیشہ میرے شاملِ حال رہیں ''اقبالؔ شناسی میں بھوپال کا حصّہ'' موضوع پر کام کرنے کو کہا اور میں نے خوشی خوشی مواد یکجا کرنا شروع کر دیا۔اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے باب میں بھوپال کی علمی و ادبی ماحول سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔سردار دوست محمد خاں کے دورِ حکومت سے بھوپال کا جو علمی وادبی ماحول بننا شروع ہوا اور بھوپال میں عالموں،ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی کی گئی اس سب کی تفصیل درج ہے۔بھوپال کے آخری فرمانروا نواب حمید اللہ خاں نے اپنے اجداد کی اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اپنی شخصیت اور قابلیت کے جوہر سے چار چاند لگا دیئے۔اس سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب دوم علاّمہ اقبالؔ کی بھوپال میں آمد اور قیام کے سلسلوں کے تاریخ وار تسلسل پر محیط ہے اس کے ساتھ ہی علاّمہ اقبال کی بھوپال میں مصروفیات اور اُن کے اُس تاریخی اور عہد ساز وظیفہ کی تفصیل،جو نواب حمید اللہ خاں نے انہیں تفویض کیا تھا،درج ہے۔علاّمہ اقبالؔ کی وفات اور بھوپال اور اہل بھوپال نے ان کو کس طرح اب تک یاد رکھا،ان کی یاد میں جو یادگاریں قائم ہوئیں،اہل بھوپال نے اپنے عقیدتمندانہ جذبات کے زیر اثر اقبالیات کے فروغ کے سلسلے

میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان سب کی مکمّل تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بھوپال کی اہم شخصیتوں سے علاّمہ اقبالؔ کے دورانِ قیام تعلقات وروابط اور خط وکتابت کے سلسلوں کی روداد تیسرے باب میں تحریر کی گئی ہے۔ان اہم شخصیتوں میں نواب حمید اللہ خاں، سرراس مسعود، ممنون حسن خاں، ڈاکٹر عبدالباسط، شاہ اسد الرحمٰن قدسی، عبدالحلیم انصاری وغیرہ سے علاّمہ اقبالؔ کے تعلقات کا احاطہ کیا گیا ہے۔مختصر طور پر شہزادی عابدہ سلطان ولی عہدہ ریاست بھوپال، حکیم سید قمرالحسن، محمد خلیل اللہ خاں، ارشد تھانوی، محمد احمد سبزواری وغیرہ کی شخصیت اور نیازمندی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بھوپال میں کہی گئی اقبالؔ کی منظومات اور ان پر تبصرہ باب چہارم میں شامل ہے۔علاّمہ اقبالؔ نے بھوپال میں ۱۴ نظمیں ریاض منزل اور شیش محل میں کہیں۔ان کے اصل متن اور ان نظموں کی جو شان نزول ممنون حسن خاں نے اخلاق اثر کو درج کروائی نیز ان نظموں پر ماسٹر اختر کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی جو اختلافی مسائل ہیں اُن کا موازنہ بھی درج ہے۔

باب پنجم میں علاّمہ اقبالؔ اور ان کی شخصیت اور کلام پر بھوپال میں جو کتابیں، مضامین، مقالات وغیرہ لکھے گئے ان سب پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پہلے اردو اکادیمی اور اقبالؔ ادبی مرکز کی

مطبوعات، اس کے بعد تسلسل زمانی کے لحاظ سے دیگر مطبوعات، پھر تحقیقی مقالات اور آخر میں رسائل کے اقبال نمبر زیر بحث لائے گئے ہیں۔ دراصل یہ باب اس مقالے کا سب سے ضخیم باب ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو مباحث آ گئے ہیں انہیں دوسرے ابواب میں نہ دہرایا جائے، خاص طور سے اقبالؔ کے بھوپال کی شخصیات سے تعلقات اور مکاتیب، ان کا زیر نظر باب میں تفصیلی ذکر مل جاتا ہے۔

باب ششم میں عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بھوپال میں اقبالؔ شناسی کا منزل بہ منزل جوارتقا ہوا ہے اسے رقم کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے مختلف مراحل میں مجھے ہر قدم پر آفاق صاحب کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اسی کے ساتھ شہاب الدین رومی اور میرے شفیق والدین کی حوصلہ افزائی بھی شامل رہی۔

مقالے کے موضوع کو پسند کرتے ہوئے کل ہند علاّمہ اقبالؔ ادبی مرکز کے چیرمین جناب ممنون حسن خاں مرحوم اور محترم اراکین (پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر نثار اور فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس) نے نہ صرف مقالہ کے موضوع کو پسند کیا بلکہ وظیفہ دینا بھی منظور کیا۔

علاّمہ اقبالؔ اور بھوپال کا تعلق اب تاریخ ادب کا ایک حصہ ہے۔ لاہور کو چھوڑ کر بھوپال واحد شہر ہے جہاں علاّمہ نے سب سے زیادہ قیام کیا۔ وہ مختلف

اوقات میں چار مہینے کے قریب بھوپال میں رہے اور بھوپال کو یہ افتخار عطا کیا کہ انہوں نے اپنے قیامِ بھوپال کے دوران ریاض منزل اور شیش محل میں جو نظمیں کہی تھیں ان کو جب ''ضرب کلیم'' میں شامل کیا تو نہ صرف حوالہ دیا بلکہ ضربِ کلیم کا انتساب بھی نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کے نام کیا۔

بھوپال نے اقبالیات کے فروغ میں جو حصّہ لیا ہے اور اقبآل شناسی کا جس طرح ثبوت دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی کے ساتھ خود اقبآل اور کلام اقبآل سے جس عقیدت اور ارادت کا ثبوت دیا ہے اور اس کی تفہیم کی ہے، وہ اقبآل شناسوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

نواب حمید اللہ خاں نے اقبآل کو تاعمر پانچ سو روپے ماہانہ پنشن عطا کی۔ ان کی قدر افزائی میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اقبآل کے دوست سر راس مسعود اور ان کے عاشق صادق ممنون حسن خاں اور بھوپال کے دیگر افراد سے اقبآل کے جو مراسم رہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

بھوپال نے کسی بھی زمانے میں اقبال شناسی کے چراغ کی لَو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ ''اقبآل لائبریری، اقبآل مرکز کا قیام، کھرنی والے میدان کو اقبآل کی یادگار میں اقبآل میدان کے نام سے موسوم کرنا اور وہاں اقبآل کے پسندیدہ سمبل شاہین کے ساتھ ایک مینار کی تعمیر اور اردو دنیا کا سب سے خطیر رقم کا انعام اُردو کے تخلیقی ادب میں افضل ترین خدمات کے لئے ہر سال ''اقبال اعزاز'' کے نام

سے کسی ایک فنکار کو دینا، ان کی یاد کو مستقل تازہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔

بھوپال کے مصنفین نے اقبالیات کے سلسلے کی کم وبیش ۱۲۵ اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں اقبال ادبی مرکز کے سمیناروں کے مقالات اور مباحث پر مشتمل ۵ کتابوں کے علاوہ مرکز کی اقبال کی بچوں سے متعلق منظومات کے مصوّر مجموعے (اُردو اور دیوناگری میں) کی اشاعت شامل ہے۔ تین جلدیں ''بیاضِ مجلسِ اقبال'' کے نام سے چھپیں جبکہ باقی دو جلدیں ''مجلسِ اقبال'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں کون سا ایسا اقبال شناس ہے جس کا پرچہ شامل نہیں۔ آل احمد سرور، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، خواجہ احمد فاروقی، ظ انصاری، اسلوب احمد انصاری، شارب ردولوی، ظہیر احمد صدیقی، خلیق انجم، قمر رئیس، سیّدہ جعفر، مسعود حسین خاں، محمد حسن، زاہدہ زیدی، عبدالمغنی، ابن فرید، مظفر حسین برنی، شمیم حنفی، عبدالحق، غرض کہ اقبال شناساؤں کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہے۔ یہ کتب بلاشبہ اقبال شناسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

اقبال مرکز کے علاوہ اقبال صدی کے دوران اُردو اکادیمی کا اقبال صدی کا دوروزہ سمینار اور وہ انڈو پاک مشاعرہ جس میں ایک لاکھ سے زیادہ باذوق سامعین نے شرکت کی تھی اور جو مشاعروں کی تاریخ کا اہم ترین مشاعرہ بن گیا۔ پھر سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ''اقبال آئینہ خانے میں'' کی اشاعت اور ادبی حلقوں میں اس کی جو پذیرائی ہوئی وہ اس کا صحیح معنوں میں مستحق

تھا۔اس میں شامل اکثر مضامین ایسے تھے جن کے ذریعے اقبالؔ کی فکر وفن کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے۔

دوسری اہم کتابوں میں صہبا لکھنوی (ثم بھوپالی) کی ''اقبالؔ اور بھوپال'' پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی ''ہندوستان میں اقبالیات'' اخلاق اثر کی ''اقبالؔ اور ممنون'' نیز ممنون حسن خاں صاحب اور پروفیسر آفاق احمد کی مرتبہ مجلس اقبالؔ کی مختلف جلدیں اور ماسٹر اختر کی کتاب ''ریاست بھوپال اور اقبالؔ'' وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بھوپال کی درسگاہوں سے خصوصی اقبالؔ نمبر بھی شائع ہوئے۔جن میں سیفیہ کالج کا ''یادگار اقبال مجلّہ'' بھی شامل تھا۔

بھوپال میں لکھے گئے دو تحقیقی مقالے ایسے تھے جنہوں نے ان موضوعات کا احاطہ کیا جن پر آج تک کوئی تفصیلی کام نہیں ہوا تھا۔بعد میں ان مقالات پر برکت اللہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔ان میں سے ایک میں اقبالؔ کے اُردو کلام کی شرحوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا تھا جبکہ دوسرے میں اقبالؔ کے کلام میں مقامات ارضی کی جو اہمیت اور معنویت ہے ان پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ مقالات ڈاکٹر فرزانہ رضوی اور ڈاکٹر پری بانو نے تحریر کئے تھے۔

زیرنظر مقالہ اس سلسلے کی تیسری کوشش ہے جس کے ذریعے بھوپال میں اقبال شناسی کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے اسے سیاہ وسفید کے درمیان محفوظ کرنے کی سعی

کی گئی ہے۔

چار بیت کی تاریخ میں ایک اضافہ اس شہر میں کیا گیا جبکہ اس کے روایتی انداز سے ہٹ کر کسی ایک شاعر کے کلام سے چار بیت کو آراستہ کیا گیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو صرف علاّمہ اقبالؔ کے کلام سے منور چار بیت کے انعقاد کا سہرا اقبالؔ ادبی مرکز کے سر رہا۔

دارالاقبالؔ بھوپال کا نام اقبالیات کے فروغ کے سلسلے میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے۔ جب وہ وسط ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی تب اور جب وہ ہندوستان کے سب سے وسیع وعریض صوبے مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنی تب سے لے کر آج تک اقبالیات کے سلسلے میں اہم کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔

بھوپال میں اقبالؔ شناسی کے سلسلے میں جو کتب لکھی گئی ہیں ان میں قوی دسنوی، اخلاق اثر اور ماسٹر اختر نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اقبالیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے آخر الذکر دونوں صاحبان کی کتب بھوپال اور اقبالؔ سے متعلق ہیں جبکہ اوّل الذکر نے دوسرے موضوعات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اخلاق اثر نے جناب ممنون حسن خاں کی خوشہ چینی کی ہے جبکہ ماسٹر اختر نے جارحانہ لہجہ میں اقبالؔ سے بھوپال کے تعلق اور ممنون صاحب اور ڈاکٹر لمعہ سے اقبالؔ کے رشتوں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ قوی دسنوی نے علامہ اقبال اور بھوپال میں'' کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب جلد بازی میں لکھی گئی ہے۔

البتہ اس سلسلہ کی کتب میں صہبا لکھنوی کی ''اقبال اور بھوپال'' گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے بھوپال سے ہزاروں میل دور بیٹھے ایک دوسرے ملک میں جس طرح مواد کی فراہمی کے سلسلے میں تگ ودو کی ہے اور موجود مواد کی روشنی میں جس طرح استخراج نتائج کا حق ادا کیا ہے اس کے لیے ان کی مساعی کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن اس کتاب کے بعض گوشے بھی مزید تحقیق کے محتاج ہیں۔

بھوپال میں اقبالیات کے جو چراغ روشن ہوئے ہیں ان کی لو کبھی مدھم نہ ہوگی۔ خواہ اقبالؔ مرکز کے سمینار ہوں یا پی۔ ایچ۔ ڈی کے ڈاکٹر فرزانہ رضوی اور ڈاکٹر پری بانو کے تحریر کردہ مقالات یا اقبالؔ لائبریری اور مینار شاہین۔ علمی، ادبی اور عوامی سطح پر جتنا کچھ کام ہوا ہے اس نے اقبالؔ شناسی کا اجالا دور دور پھیلانے میں مقدور بھر حصہ لیا ہے۔ مستقبل کا مورّخ جب بھی اس سلسلے میں قلم اٹھائے گا تو بھوپال اور اقبالؔ کے رشتے کی استواری ضرور اس کا موضوع قرار پائے گی۔ کیونکہ دارالاقبالؔ کو اقبالؔ نے جس طرح اپنی نظموں پر شیش محل اور ریاض منزل کا حوالہ درج کر کے اسے اندلس اور قرطبہ کے ہم پلّہ بنا دیا ہے وہ کسی دوسرے شہر کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور اہل بھوپال نے جس طرح اقبالؔ سے اپنی عقیدت وارادت کا مختلف طریقوں سے ثبوت دیا ہے اور ان کی یاد اور یادگاروں کو تابندہ رکھا ہے وہ بلاشبہ اقبالیات کا روشن باب ہے۔

چودھری مظفر حسین

فکرِ اقبالؔ کی روشنی میں زرعی توسیع

فنون لطیفہ کا معاشرتی وظیفہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے نظریات کو جذبات اور احساسات کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے تا کہ عوام الناس کے ذہنوں کو بغیر کسی دقت کے ان سے متاثر کیا جا سکے۔ فنون اور شعر و شاعری مکمل اور بلا روک ٹوک ابلاغ کا وہ واسطہ ہیں جنہیں معاشرے کو تجرباتی اشتراک کی اساس پر استوار کرنے، مطلوبہ معاشرتی مزاج پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے بطور تمدنی ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی معاشرے میں تہذیبی اقدار کے نفوذ کے لئے فن و شاعری کا سہارا لیا جاتا ہے کیونکہ ان کے وسیلے سے یہ اقدار بآسانی جزو معاشرہ بن کر فی الفور انسانی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لوگوں کی روحانی زندگی پر ان کے انہی تعمیری اثرات کے پیش نظر توسیع زراعت جیسے قومی تعمیر نو کے کاموں میں ان کے اہم کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بقول مسٹر موشر ''توسیع زراعت کے کام میں لوگوں کی روح کا بھی عمل دخل ہے''۔ کسی تعمیری کام کو منصۂ شہود پر لانے سے پیشتر ایک نفسیاتی فضا پیدا کرنا ازبس

ضروری ہے۔ مسٹر موشر کے نزدیک ولولہ اور عزم صمیم ''اِنجن'' علم و ہنر'' آلات و اوزار'' اور پیشے اور شہریت ''مواقع'' کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

اقبال کسی قوم کی مجموعی ترقی کے لئے فن اور شعر و شاعری کے تعمیری کردار سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ ''کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس ولولے کی نوعیت پر ہے جو اس کے فنکار اور شاعر حاصل کرتے ہیں''۔ اس لئے وہ شعراء کو ان کی ولولہ انگیز شخصیت کے ناطے سے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے کسی رو بہ انحطاط یا بیمار شخصیت کی تخلیق سے معرض وجود میں آنے والا ایک گیت یا ایک تصویر ہلاکو اور چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہی لا سکتی ہے۔ چنانچہ شعر و شاعری کی صرف اسی نوع کو قابل قدر گردانتے ہیں جو طاقت اور جمال میں باہمی امتزاج پیدا کرنے کی صفت سے بہرہ ور ہو۔ اس کیفیت کی جستجو کرنا جسے سائنس کی زبان میں فطرت سے ''موافقت'' کہا جاتا ہے۔ دراصل روح انسانی پر فطرت کی بالا دستی کو تسلیم کرنا ہے۔ طاقت فطری محرکات کی مزاحمت کے راستے سے آتی ہے نہ کہ ان محرکات کے عمل کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دینے سے۔ جو کچھ ''موجود ہے'' اس کی مزاحمت کر کے ''جو کچھ وجود میں آنا چاہیے'' کو پیدا کرنا صحت اور زندگی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ انحطاط اور موت ہے۔ خدا اور انسان دونوں پیہم عمل اور جذبہ آفرینش سے زندہ ہیں۔ ایک سچے فنکار کے تصوّر کو اُجاگر کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں۔ ''ایسا

فنکار جو زندگی سے آنکھیں چار کرتا ہے۔ دراصل انسانیت کے لئے باعث سعادت ہے۔ وہ خدا کا ساتھی ہے اور اپنی روح میں زمانے اور ابدیت کو ایک دوسرے سے مدغم ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ ''فشٹے کے الفاظ میں ایسا شخص پوری فطرت کو بھرپور، اور وافر پاتا ہے۔ برعکس دوسرے شخص کے جو ہر شے کو اس کی اصل حیثیت سے بھی نحیف تر، کمتر اور خالی تر دیکھتا ہے۔[۳]

فلسفۂ تغیر و طاقت

اقبالؔ کا آئیڈیل طاقت ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کو طاقت کا ہم معنی قرار دیتے ہیں[۴] اور طاقت ور انسان کو بہ نظرِ تحسین دیکھتے ہیں۔ ایک طاقت ور انسان کے متعلق اپنے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں کہ طاقتور انسان اپنا ماحول خود پیدا کرتا ہے اور کمزور انسان اس ماحول کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔[۵] قوت گیر صفات کو اپنے اندر سمو لینے سے ایک طاقت ور انسان ایک لامتناہی اُمنگ سے سرشار ہو جاتا ہے اور اپنی ان اُمنگوں کو عملی جامہ پہنا کر کرۂ ارض پر خدا کے نائب کا مرتبہ حاصل کرنے کا سزاوار وہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایک بالکل نیا طبعی اور معاشرتی ماحول معرض وجود میں لائے[۶]۔ بالفاظ دیگر اسے ''خدا کی بادشاہی کو زمین پر لانے'' کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہی وہ مناسبت ہے جس سے اقبالؔ کے افکار توسیع زراعت کے لئے گہری معنویت رکھتے ہیں۔ ان کے فکر کے کئی ایک پہلو تو ایسے ہیں جو فلسفۂ توسیع اور اس کی روح سے براہ

راست تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصاً فلسفۂ خودی ایک ایسا فکری سانچہ فراہم کرتا ہے جس کے اوپر توسیع کے فلسفے کا فکری ڈھانچہ تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ مقاصد کا تعین ہوسکتا ہے اور توسیع زراعت کو ایک بامعنی رخ عطا کیا جاسکتا ہے۔

تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ زرعی توسیع کا مقصد خارجی طور پر کسی خاص دیہی آبادی کے معیارِ زندگی کو ہنر اور کاریگری کے استعمال سے مسلسل بلند سے بلند تر سطح پر لے جانا ہے۔ جبکہ باطنی طور پر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس آبادی میں ایسی اقدار پیدا کی جائیں جو معاشی ترقی کے ساتھ سازگار ہوں اور یہ اقدار اس قوم کے مخصوص تہذیبی ورثے کے عین مطابق ہوں۔ بالفاظ دیگر یہ دیہی آبادی میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کا عمل ہے جو ان کے علم، ہنر، رویے، رجحان اور میلانات میں تبدیلی لاتا ہے۔ اقبالؔ انقلاب و تغیر کے پیغام بر ہیں اور تبدیلی کے لئے اس کی یہ آرزو بے پناہ جوش میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کے نظامِ فکر اور شاعری میں تغیّر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کے زاویۂ نگاہ کے مطابق کائنات میں صرف اک تغیّر کو ہی دوام حاصل ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اک تغیّر کو ہے زمانے میں ؎

فرد انسانی کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیر فلک کہیں میں نے ۸

سماجی زندگی میں بھی یہ تغیّر ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد بن جاتا ہے جو معاشرے کو زندگی اور قوت عطا کرتی ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کش مکش انقلاب ۹

ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں ۱۰

مسئلہ ناداری وغربت

علامہ اقبالؔ آج کے مسلم معاشرے میں جو اساسی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔ان میں سے ایک مسلم معاشروں میں پھیلی ہوئی عام غربت کو ختم کرنا ہے۔ غربت اور معاشرتی پسماندگی سے انہیں بہت نفرت تھی اور وہ اسے حقارت کی نظر

سے دیکھتے تھے۔ مثلاً ان کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو جائے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں؟''[۱۱] تاہم ان کے نزدیک غربت سے نمٹنے کے لئے صحیح لائحہ عمل کا تعین صرف اسلامی تہذیب کرتی ہے جس کے مطابق زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ حسیاتی (Sensate) اور تخیلاتی (Ideational) تہذیبوں کے برعکس اسلامی تہذیب معیشت اور اخلاق کے باہم دگر منحصر ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ حسیاتی تہذیب میں زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین محض ''خوشگوار ترنگ'' کا حصول ہے۔ جبکہ تخئیلاتی تہذیب میں (لاحاصل) سرور انگیز تصوّرات میں (گیان دھیان) گم رہنا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ اسلام کی مثالی تہذیب میں اعلیٰ ترین نصب العین یہ ہے کہ ایسے معاشرے کو معرض وجود میں لایا جائے جو غم اور خوف سے پاک ہو۔ اس تناظر میں معاشرے سے غربت کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے پیدا ہونے والا ایک بلند ترین اخلاقی داعیہ بن جاتا ہے۔ اقبالؔ کا کہنا ہے ابتدائی دور کی عیسائیت کے پیروکار مفلسی اور دنیا بیزاری کو اپنی شان سمجھتے تھے جبکہ اسلام غربت کو ایک برائی سمجھتا ہے[۱۲]۔ ایک ایسا معاشرہ جو سرتاسر ذلت آمیز مفلسی میں ڈوبا ہوا ہو، اعلیٰ معیار کی ایسی تہذیبی سرگرمیوں میں حصّہ نہیں لے سکتا جو انسانی شخصیت کو اعلیٰ

مدارج پر فائز کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اقبالؔ کہتا ہے:

''مفلسی کا آزار انسان کے روحانی قویٰ کا دشمن ہے'' ۱۳؎

''غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلی آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے ۱۴؎۔ غربت کے مسئلے پر اخلاقی و معاشی پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے وہ معیشت اور اخلاقیات کے باہمی مضبوط ربط پر زور دیتا ہے۔

کس نبا شد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں این است و بس ۱۵؎

ان کا کہنا ہے کہ علم الاخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لئے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نظر ڈالنی چاہئیے۔

کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے یا یوں کہیے کہ ہر شے کی اصل وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت کو ہی لے لو، اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں مدد نہیں دیتی تو پھر اس کا فائدہ ۱۶؟

توسیع اور اقبالؔ کے فلسفۂ تعلیم کا باہمی تعلق

اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار میں وہ مطلق خوبی جسے انسانی زندگی میں سب سے بلند مرتبہ حاصل ہونا چاہیئے، پرورش خودی ہے۔

نہ تُو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے ۱۸

تو زندگی ہے پائیندگی ہے
باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی ۱۸

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ بھی تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو ۱۹

اقبالؔ کے تصوّر میں فردِ انسانی ''طاقت، توانائی اور ارادے کی اکائی ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے پاس بے انتہا طاقت ہے اور اس طاقت کو بتدریج روبہ ظہور لانا ہی انسانی سرگرمیوں کا منشا ہے'' اس تصوّر کے مطابق ''انسان کا جوہر اصلی ارادہ ہے نہ کہ ذہانت اور فکری استعداد'' ہیں۔ ان کے خیال میں مثالی اسلامی اخلاق ''ایک مضبوط جسم ہی ایک مضبوط ارادے کا مالک ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات کا مطلوبہ نصب العین انسانی ارادے کی تربیت ہے نہ کہ ذہانت اور عقل وفکر کی''۔ ان کے نزدیک ہر تعلیمی نظام کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ انسان کے کردار کی تشکیل کرے جسے اقبالؔ صحیح معنوں میں انسان کا حتمی سروسامان سمجھتا ہے جو نہ صرف ایک معاند فطری ماحول natural environment سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے بلکہ اپنے ہم جنس لوگوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کرنے اور سبقت حاصل کرنے کے قابل بنائے جو اُس کے ساتھ ایک بھرپور، خوشحال اور وافر رہن سہن کے حصول کی دوڑ میں شریک ہیں۲۰۔

توسیع کا کام خواہ نہایت ہی واضح طور پر کاشت کاروں کے معاشی پہلو سے متعلق کیوں نہ ہو یہ کام اس کی شخصیت کے عقلی پہلو کی ترقی پر قانع نہیں رہ سکتا ۔ اس کا منتہائے مقصود ایک اولوالعزم شخصیت کا ارتقاء ہونا چاہئیے ۔ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی صلاحیت کے لئے بھی ایک خاص قسم کے کردار کی

ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے نئے علوم و ہنر سکھانے پر مرکوز تمام تعلیمی کاوشیں اس طرح کی جانی چاہئیں کہ وہ اس کے ارادے کا ایک لازمی جزو بن کر عمل میں ڈھل جائیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے۔ جہاں اقبالؔ کا فلسفۂ تعلیم و تربیت توسیع زراعت کے لئے گہری مناسبت رکھتا نظر آتا ہے۔ کئی ایک نقاط ہیں جن پر جدید نظریۂ توسیع اور اقبالؔ کے فلسفۂ تعلیم میں واضح طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر برٹن کا نظریۂ تعلیم جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ زراعت کی مرتبہ کردہ کتاب دستورالعمل برائے توسیع کا ایک اہم حصہ ہے دعویٰ کرتا ہے کہ عمل آموز گاری کے دوران تعلیم فرد کی شخصیت ایک اساسی کل (Integrated whole) میں سے مسلسل عمل تفرید کے ذریعے نئے انداز اختیار کر کے ارتقاء حاصل کرتی چلی جاتی ہے اور نئے اور تازہ کل کو وضع کر کے انہیں اپنے اندر سموتی ہے۔[۱۲] اقبالؔ کے ہاں بھی خودی کی تعریف قریب قریب یہ مفہوم لئے ہوئے ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''حیات خودی ایسی کشمکش سے عبارت ہے جو خودی کے اپنے ماحول پر اور ماحول کی خودی پر جو اسی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ خودی اس باہمی یلغار کے اس میدان کارزار سے باہر ایک غیر جانبدار تماشائی کی طرح کھڑی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ اس سارے معرکے میں ایک رہنمائی کرنے والی قوت کی شکل میں موجود ہوتی ہے اور اپنے ہی تجربے کی بنا پر تشکیلی مراحل سے گزرتی اور

منضبط ہوتی ہے''۲۲۔

جیرارڈ کے ہاں زیرِ تعلیم فرد کی شخصیت کا تصوّر بھی اقبال کے اس تصوّرِ خودی کے بالکل قریب ہے جس کا ابھی ہم نے اُوپر خطبات اقبالؔ سے اقتباس درج کر کے حوالہ دیا ہے۔ رابنسن جیرارڈ کے اس تصوّرِ متعلم کی وضاحت جو اس نے اپنی کتاب ''سائنس اور سائنسی تعلیم کی نوعیت'' میں پیش کیا ہے ۲۳۔

برٹن (Burton) کے نزدیک زیرِ تعلیم فرد کا تصوّر ایک ہدف کی متلاشی ہستی کا تصوّر ہے۔ جس کی تمام سرگرمیوں کا رُخ اپنے مقاصد کی سمت میں ہوتا ہے اور وہی انہیں منضبط کرتی ہیں۔ اور توازن کو بحال اور برقرار رکھنے کے لئے آخر کار ایک عمومی مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ زیرِ تعلیم شخص ایک کلی وجود کی شکل میں اپنا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے اور یہ ردِ عمل مجموعی صورتِ حال، مجموعی احوال اور مجموعی سانچوں کے خلاف ہوتا ہے اور اس تعلم کا ماحاصل تاثرات، تاثرات کا انضباط، نئی قدریں، تفہیمات، رویے، بصیرتیں، خصوصی استعدادیں اور ہنر ہوتے ہیں ۲۴۔

کسبِ علم کرنے والے کے جو اوصاف برٹن نے بیان کئے ہیں ان کا سراغ ہمیں اقبالؔ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتا ہے۔

''ہر آدمی اپنی ''شاکلہ'' کے مطابق عمل کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون بہترین طریق ہدایت پر گامزن ہے'' ۲۵ اس طرح میرے

تجربے کا حاصل محض ایک دوسرے سے اعتبار پکڑنے والے اعمال کا وہ سلسلہ ہے جو ایک رُخ عطا کرنے والے مقصد کے وحدت کی وجہ سے باہم مرتبط ہو جاتے ہین ۔ آپ میری شخصیت کے خلاء میں پڑی ہوئی ایک چیز یا محض زمانی تربیت میں چند ایک تجربوں کے مجموعے کے طور پر صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتے اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ مجھے میرے فیصلوں، میرے ارادی رویوں، میرے مقاصد اور میرے ولولوں کے ذریعے میرے اعمال کی تعبیر کے ذریعے مجھے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں ۲۶۔

انسان بحیثیت مظہر ارادہ

انسان کو ایک ارادے کی مظہر ہستی اور زندگی کو ایک اور نصب العین کے لئے جدوجہد کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اقبالؔ انسانی شخصیت کو مختلف النوع ارادوں کی باہمی ترتیب متصور کرتے ہیں ۔ انسانی شخصیت کے پہلوؤں کی تشکیل کرنے والے ارادوں کی فہرست نیچے دی جاتی ہے ۔

شخصیت کے پہلو	احتیاجات	داعیات
حیاتی	۱) خوراک	ارادہ وجود نفس
	۲) لباس	ارادہ بقا
	۳) رہائش	ارادہ زیست

عمرانی حیات	۱) ازدواج		
	۲) بقائے نسل		ارادہ بقائے نسل
عمرانی ثقافتی	۱) تعلیم		ارادہ حصول علم
	۲) کسبِ معاش		ارادہ کسب مال وافزائش دولت
نفسیاتی	۱) ادراک وتعقل		ارادہ ادراک وتعقل
	۲) ارادہ وعزم	ہم آہنگی	ارادہ عمل
	۳) جذبہ ومحبت		ارادہ محبت
انفسی	۱) شعور	ہم آہنگی	شعور ولاشعور کو ہم آہنگ کرنے کا ارادہ
	۲) لاشعور		ارادہ
ماورائی	۱) علم		حقیقت اولیٰ کو جاننے کا ارادہ
	۲) فنون لطیفہ		دنیا کو ایک جمالیاتی نظام میں ڈھالنے کا ارادہ
	۳) اخلاقیات		دنیا کو ایک اخلاقی نظام میں ڈھالنے کا ارادہ
	۴) مذہب	ا) تعلق باللہ	تعلق باللہ پیدا کرنے کا ارادہ
		ب) اجابت دعا	دعا میں تاثیر پیدا کرنے کا ارادہ
		ج) قرب الٰہی	قرب باری تعالیٰ کے ذریعے حیاتِ جاوداں کا ارادہ
		د) مثالی معاشرہ	دنیا میں مثالی معاشرہ پیدا کرنے کا ارادہ

اسلام جس مثالی تمدن کے قیام کا داعی ہے اس کا مطمع نظر ایک ایسی

شخصیت کی تعمیر ہے جس میں یہ تمام ارادے اس طرح منضبط ہوں کہ شخصیت کے ماورائی پہلو سے تعلق رکھنے والے ارادوں کو سب پر فوقیت حاصل ہو اور دوسرے تمام ارادے ان کے زیرِ اثر ہوں۔ بنابریں اقبال کا تصوّرِ خودی خودشعوری کی وہ قسم ہے جو خداشعوری سے پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی ہے۔

خودی کا سر نہان لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ [۲۷]

اقبالؔ کے مطابق جب انسان میں ایسی شخصیت معرضِ تشکیل میں آتی ہے تو انسان ایک حیات نو پاتا ہے۔ جب خداشعوری اس کی خودشعوری کو روشنی عطا کرتی ہے تو اسے کائنات میں اپنے اس اصلی مقام سے آگہی نصیب ہوتی ہے کہ وہ قدرت کی عظیم ترین قوتوں مین سے ایک جس کو خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے کہ وہ فطری ماحول کو مسخر کر کے ایک مثالی معاشرہ قائم کرے اور کائنات کو طرح نو دے کر۔ نئے انداز میں استوار کرے یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ انسان کی محض ذہنی وفکری نشوونما کو بے اطمینانی کے ساتھ دیکھتا ہے۔

شخصیت کا ذہنی وفکری پہلو ہماری مجموعی شخصیت کا محض ایک پہلو ہے، من حیث الکل تشخص کا حصول اس جہان بسیط کے محض متنوع اثرات اپنے

ذہن پر مرتسم کرنے اور ان کا مجرد مشاہدہ کرنے سے ممکن نہیں، نہ ہی یہ محض ان تاثرات کو وصول کرنے اور انہیں فکری اشکال عطا کر دینے سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ان مہیجات کا رخ مثالی نصب العین اور مقاصد کی طرف پھیرنے سے ہی وہ کلی تشخص پیدا ہوتا ہے جس سے اس کے اندر یہ احساس جنم لیتا ہے کہ وہ قدرت کی عظیم الشان قویٰ میں سے ایک ہے۔۲۸ اگر ماورائی قدریں انسان کے تمام ارادی نظام پر حاوی ہوں تو یہ اس میں ذوق خدائی رکھنے والی شخصیت کو نشو ونما دیتی ہیں۔ نتیجتاً اس میں ایسی بصیرت جلد پاتی ہے کہ وہ اس مادی عالم کو اعلیٰ عمرانی مقاصد کے حصول کے لئے اپنے زیر نگیں سمجھتا ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی۲۹

اور

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمین سے تا بہ ثریا تمام لات و منات ۳۰

پھر

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو نام اس کا آسمان
زیرِ سر آگیا تو یہی آسماں زمین ۳۱

پھر یہ بھی ملاحظہ ہو۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ ۳۲

انسانی مقاصد کے حصول میں حائل مادی عالم کی رکاوٹیں دراصل تگ و دو کے لئے ایک ترغیب اور خودی کی نمو کے لئے ایک سازگار ماحول مُہیّا کرتی ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیمات کی رو سے وہ کائنات جس سے ہمیں سابقہ ہے باطل نہیں ہے، اس کے فائدے ہیں اور سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ ان کی پیش

کردہ رُکاوٹوں پر غلبہ پانے کی جدوجہد میں ہماری بصیرت صیقل ہوتی ہے۔ ہم ان کی ظاہری سطح کی تہہ میں پوشیدہ حقیقت کو جاننے کے لئے غوطہ زن ہوتے ہیں اور خدا کے مزید قریب ہو جاتے ہیں ۳۳ کیونکہ یہ عالم محسوس پر تصرف اور غلبہ ہی ہے جو ہمیں اس محسوس (کائنات) سے آگے جانے کے قابل بناتا ہے ۳۴۔ اس لئے اقبالؔ کی نصیحت یہ ہے کہ عالمِ مادہ جو خودی کے سامنے اس کے مدِ مقابل کے طور پر آ کر کھڑا ہوتا ہے، فی الحقیقت ایک ناگزیر رکاوٹ ہے جو ہماری ہستی کو ایک تازہ شکل عطا کرتی ہے ۳۵۔

علمی رویّہ

اقبالؔ کے ان تصورات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کے نظامِ فلسفہ میں عملی یعنی سائنسی اور تجرباتی رویہ ایک انتہائی اہم مقام حاصل کر لیتا ہے۔ کیونکہ فطری ماحول کی تسخیر کے ذریعے ہی انسانی خودی اعلیٰ روحانی مدراج تک پہنچنے کے لئے نمو پاتی ہے۔ اس ضمن میں اقبالؔ ''عمل'' کو فکر کی ایسی ''اعلیٰ ترین شکل'' کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو ہر لحظہ اپنے نتائج پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

یہی آئین فطرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے ۳۶

اور

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے ۳۷

اور یہ بھی ملاحظہ ہو۔

ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام ۳۸

اقبالؔ ایسے انسان پر افسوس اور ماتم کرتے ہیں جو اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل نہیں ہوتا۔

ناپید ہے بندہ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی
ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا
اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا ۳۹

وہ ایسے علم کی پُرزور مذمت کرتے ہیں جو آمادۂ پیکار نہیں کرتا۔ اسی لئے وہ ایسے تمام لٹریچر اور فلسفے کی بھی مذمت کرتے ہیں جو عمل پر منتج نہیں ہوتا۔

ناداں ادب و فلسفہ کوئی چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو ۴۰

اور

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت ۴۱

ان کے نزدیک صرف یقین محکم ہی آبِ حیات ہے اور صرف وہی فلسفہ ہائے زندگی قابلِ اعتنا ہیں جو مضبوط عقائد سے قوت حاصل کرتے ہیں اور عمل تک لے جاتے ہیں۔

حرف اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جن کا ضمیر ۴۲

ایک دوسری جگہ فرمایا

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا ۴۳

لیکن واضح رہے کہ عقیدہ وعمل دونوں کے سوتے ایسے اعلیٰ اصولوں اور

بلند مقاصد سے پھوٹتے ہیں جنہیں زندگی میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوتا ہے۔

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ اور مہر کو تاراج [۴۴]

ایک ایسی قوم جو زندگی کے اعلیٰ اصولوں اور مقاصد سے ولولہ پاتی ہو وہ کبھی ایک حالت پر قانع نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اسے اپنی حالت کو بدلنے اور اپنی دلی خواہشات کے مطابق ماحول کو ڈھالنے کے لئے ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کرنی چاہیے۔

ایک ایسا مومن جو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ایک مثالی معاشرے کو وجود میں لانے کے ولولے سے تحریک پاتا ہو کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اسے تو تمام دنیا مسخر کرنا ہے، اسے اپنے اردگرد کے طبعی ماحول کو زیادہ پیداآور (Productive) بنانے کے لئے انہیں منظم و منضبط کرنا ہے تاکہ خوف و حزن سے پاک معاشرہ پیدا ہو سکے۔ چنانچہ ایک ہمیشہ جاری و ساری رہنے والا انقلاب اس کی زندگی کا مشن ہوتا ہے۔

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ [۴۵]

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوق انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب [۴۶]

اس لئے وہ انسان کو ایسی نامکمل کائنات کے خلاف ایک جہدِ مسلسل کے لئے پکارتا ہے جسے انسانی کاوشوں سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچنا ہے اور اسے اپنا ماحول خود پیدا کرنا ہے۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخی فکر و کردار کا
تُو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت [۴۷]

توسیع میں فلسفۂ اقبالؔ بطور دلیلِ راہ

اُوپر دیئے گئے اقتباسات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کی شاعری امید، اعتماد، ولولے اور عزم مصمم کا ایک پیغام ہے۔ اس کے تمام فلسفے کو ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مقاصد جتنے اعلیٰ ہوں گے اسی قدر ان کے حصول کے لئے شدت سے جدوجہد ہوگی اور جتنی شدت سے جدوجہد زیادہ ہوگی اور رفتارِ عمل جتنی تیز ہوگی اتنے ہی نتائج مثبت ہوں گے۔

ہے آب حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی ۴۸

ہمت کو شناوری مبارک
پیدا نہیں بحر کا کنارا ۴۹
چاہے تو بدل ڈالے ہئیت چمنستان کی
یہ ہستی دانہ ہے، بینا ہے، توانا ہے ۵۰

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ اقبالؔ کی شاعری سے جنم لینے والی جذباتی فضا معاشی خوشحالی کے نظریے کو جو زرعی توسیع کا ایک لازمی وظیفہ

ہے، مقبول عام بنانے کے لئے کتنی سازگار ہے۔ اس کی فلسفیانہ بصیرتیں اور شاعرانہ تخیلات و اشارات ہمارے عوام کے لئے خصوصی کشش رکھتے ہیں۔ اقبالؔ کے فکر وفن کی یہ خوبیاں اس کے پیغام کو زرعی توسیع کے لئے بے حد موزوں بنا دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام ہر شعبہ زندگی میں ترقیاتی جد وجہد کے لئے ہراول (حدی خواں) کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور توسیع زراعت یقیناً ان میں سے ایک ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمارے توسیعی کارکنوں کے لئے اقبال کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ مطالعہ نہ صرف معاشرتی ترقی کے لئے ایک تمدنی دلیل و جواز کے طور پر ضروری ہے بلکہ اپنے زاویۂ نگاہ اور تصورِ کائنات میں انقلاب لانے لئے بھی ناگزیر ہے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی

اقبال دشمنی یا دریدہ دہنی۔ ایک تجزیہ

امام غزالیؒ نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ ''محسود ہونا باعثِ سعادت ہے'' انسان کی نفسیات میں فطرتاً یہ بات شامل ہے کہ وہ رشک، حسد، دشمنی، عیب گوئی، نُقطہ چینی، تحقیر اور تضحیک کا سہارا لیکر اپنے ہم عصر، ہم عمر اور ہم پیشہ انسانوں سے معاندانہ انداز میں ملتا ہے حاسدانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور دشمنانہ ردِّعمل دکھاتا ہے اور کبھی کبھار شر اور شرارت کے اسلحہ سے لیس ہو کر دشمنی پر بھی اتر آتا ہے۔ صحت مند تنقید ہو یا رشک و رقابت کا عمل ہو، یہ چیزیں قابلِ اعتراض نہیں، لیکن جب کسی شخصیت پر اعتراضات دشمنی اور دریدہ دہنی کی حُدود میں داخل ہو جاتی ہیں، تب جا کے یہ فعل قبیح اور قابل اعتراض بن جاتا ہے۔

اقبال کوئی مافوق البشر شخصیت نہیں ہے۔ ان کی ذات اور شاعری تنقید سے بالاتر بھی نہیں ہے، ان کے کلام کے کئی گوشوں سے اختلاف رائے کی گنجائش بھی موجود ہے، ان کی عملی زندگی میں کئی تضادات کے نشانات بھی موجود ہیں، اور

ان کے فکر میں تبدیلی اور ارتقا پذیری کی متنوع صورتیں بھی ہمارے سامنے ہیں، لیکن باوجود اس کے ان کے کلام و پیغام نے ہمارے اس تحتی برِّ اعظم میں ایک حیران کن اثر اور شعر و ادب کے شائقین و ماہرین پر مسحور کُن حالت طاری کر دی۔ اس بے پناہ پذیرائی، قبول عام اور اثر آفرینی نے ان کے لئے درجنوں دشمن، مُعترِض اور غیر ذمہ دار انتقاد پیدا کئے، جو اقبالؔ کی شخصیت، شاعری اور حالاتِ زندگی پر بے جا اِعتراضات کرتے رہے ہیں اور ادبی بد دیانتی پر مبنی نام نہاد تنقید نگاری کے تیر تکے چلاتے رہے۔

اقبالؔ کی شبیہہ کو مسخ کرنے کے سلسلے میں ان پر ''شراب نوشی'' کا سنگین الزام کچھ لوگوں نے عائد کیا ہے، جن میں اقبالؔ کے چند ارادت مند بھی شامل ہیں۔ مثلاً محمد شریف بقاؔ، عبدالمجید سالکؔ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم جیسے لوگ ان دو شعروں سے اقبالؔ کی ''مے نوشی'' پر استدلال کرتے ہیں۔

مے از مے خانۂ مغربی چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم

---☆---

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ آفیت داماں زدم

ظاہر ہے کہ لندن اور جرمنی کے معاشروں میں شراب کا رواج عام ہے اور وہاں کے لوگوں کے طرزِ معاشرت میں یہ کوئی زیادہ بُری چیز نہیں ہے تاہم اسلامی نقطۂ نگاہ سے شراب نوشی ناپاک شئے ہے اور شیطان کے عمل سے جڑی ہوئی ہے اور حدیث کے الفاظ میں اُمُ الخبائث میں سے ہے۔ اقبالؔ ان تمام احکامات سے باخبر تھے۔

حیاتِ اقبالؔ کے چار ادوار (الف) سیالکوٹ میں زمانۂ طالب علمی (ب) لاہور میں تعلیم اور ملازمت (ج) قیام یورپ اور (د) قیام لاہور تا انتقال میں کوئی عینی، یا دستاویزی شہادت میسّر نہیں، جس سے یہ استنباط کیا جاتا کہ اقبالؔ نے کبھی شراب نوشی کی ہے۔ ''مے از مے خانۂ مغرب چشیدم'' اور ''بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم'' یورپ کے علمی سرچشموں سے سیراب و فیضیاب ہونے اور وہاں کے مخلوط نظامِ تعلیم سے استفادہ کرنے کی طرف شاعرانہ اشارہ ہے۔ اقبالؔ تو یورپ کی بادہ پرستی، مضوعی زندگی، احساسِ مروت سے محرومی اور اس کے معاشرے کے اندرون کی تاریکی پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے شراب کو ایک بار پھر علامت کے طور پر برتتے ہیں۔

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

اقبالؔ کے پینتالیس سال تک گھریلو خدمت پر مامور خادم علی بخش نے اقبالؔ کی خانگی زندگی کے حوالے سے جو بیانات، تاثرات، حالات اور واقعات بیان کئے ہیں، ان میں ایک جگہ بھی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں۔ علی بخش کا ایک بیان شراب نوشی کے الزام کے رد پر کافی ہے کہ ایک سکھ دوست اقبالؔ سے ملاقات کے بعد اقبالؔ کے مکان کے برآمدے پر شراب پینے لگا۔ اقبالؔ نے علی بخش سے پوچھا کہ کیا ''وہ سکھ چلا گیا۔'' علی بخش بولا، ہاں چلا گیا، لیکن اپنے ٹانگے سے کوئی بوتل لاکر برآمدے پر شاید شراب پی رہا ہے۔ علی بخش کا کہنا ہے کہ میں نے اقبالؔ کو کبھی اس قدر غضب ناک ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، جیسا غصہ لفظ شراب سن کے اقبال کو آ گیا اور کہنے لگا، اس سکھ کو فوراً برآمدے سے ہٹاؤ''۔ اپنے قیام یورپ کے دوران مے نوشی کی تردید کم از کم اقبالؔ نے خود ہی دو بار کی ہے۔ پہلی مرتبہ جب وہ کیمبل پور میں ۱۹۱۲ء کو ایک دعوت میں شریک تھے۔ کچھ انگریز آفیسر بھی محفل میں مدعو تھے۔ اقبالؔ کو جب شراب کی گلاس پیش کی گئی، تو انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے یورپ میں بھی کبھی شراب نہیں پی''۔ اس واقعہ کے عینی شاہد شیخ اعجاز احمد ہیں۔ دوسرا واقعہ حجاب امتیاز علی نے بیان کیا ہے وہ لکھتی ہیں۔ ''خطبات کے سلسلے میں اقبالؔ جب مدراس گئے تو وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل ڈایان بیلیز میں ان کا استقبالیہ رکھا گیا، جس میں مسلم اور غیر مسلم عمائدینِ شہر مدعو تھے۔ لنچ سے پہلے ہوٹل کے بہروں نے میزوں پر ریڑے

ہوئے گلاسوں میں مشروبات ڈالنے شروع کیے۔ کسی کے پوچھنے پر کہ آپ شراب پئیں گے، علامہ اقبالؔ نے جواب دیا کہ بالکل نہیں، میں نے کبھی انگلستان میں بھی شراب نہیں پی۔ یہ سن کر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں''۔

غالبؔ، جوشؔ اور فیضؔ، اردو زبان کے تین بڑے شاعر ہیں اور تینوں کی شراب نوشی چھپی ہوئی نہیں بلکہ ان کے بارے میں ہزاروں شواہد موجود ہیں۔ فقط، شراب، بادہ، مے، مئے دلربا، ساقی، خُم، مُغ اور میکدہ جیسے شعری اعترافات و علامات مے نوشی کی دلیل نہیں بن سکتے ہیں۔ ایک ملّی اور اسلامی شاعر پر اس قسم کی تہمت غلط فہمی اور دشمنی کے بغیر اور کچھ نہیں۔

فراق گورکھپوری دنیائے غزل کے ایک قدآور شاعر ہیں۔ اپنی پوری شاعری میں زناّری، اَمرد پرستی، مزاجِ نرگسی اور خیالی پیکر تراشی میں گرفتار فراقؔ اقبال کی مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر ''من آنم'' میں اقبالؔ کے طرز بیان کو ''جنگجویانہ لہجہ'' قرار دیتے ہوئے اپنے دل میں چھپے معاندانہ خیالات کی بھر پور ترجمانی کر چکے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی نے ۱۹۷۰ء کے اوائل میں ''تجلّی'' کے ایک شمارے میں فکر فراقؔ کے تار و پود پوری تنقیدی و تجزیاتی بصیرت کے ساتھ الگ کر دیئے تھے۔ فراق کے نزدیک ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کا مطلب یہ ہے کہ ''گویا غیر مسلم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ جہان ہمارا ہے''۔ فراقؔ

اپنے ضمیر مین چھپی پریشانی کا اظہار آگے بڑھ کے یوں کرتے ہیں۔''اقبالؔ ہندی احیاء سے متاثر بھی تھے اوراس کی نئی طاقت سے خوفزدہ بھی۔وہ نئے حقائق اورنئی اَقدار کوقبول کرنا چاہتے تھے اورمحسوس کرتے تھے کہ ہندوستان سے باہر اسلامی نشاۃِ ثانیہ کہیں موجودنہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایک مستقل جھنجھلاہٹ اور پریشانی کا شکار ہوگئے اور ان کی شاعری غصےؔ اور مایوسی کا اظہار بن کررہ گئی''۔فراقؔ نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اقبال کی نسبت دل کی جلن کا اظہار بار بار کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"Deeply disturbed by this new awakening and its values he seems to have hidden himself and his communal ideas under different garbs. The patriotic Iqbal was quite dead by this time and he buried his former self."

آسام سے تعلق رکھنے والے ایک اسکالر اور''ماہر اقبالیات'' ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے درجنوں مضامین اقبالؔ کے مدح وقدح میں قلمبند کئے ہیں۔ بظاہر وہ اقبالؔ دوستی کے اشارات دیتا ہے،لیکن بباطن وہ بھی اقبالؔ دشمنی سے مالا مال ہے۔اپنی انگریزی کتاب Iqbal-The Final Countdown میں وہ اقبالؔ کی تخلیقات پر اعتراضات کرتے ہوئے اور بالخصوص اقبال کے تحقیقی مقالہ

''فلسفہ مابعد الطبعیاتِ ایران'' پر تحقیر آمیز انداز بیان اختیار کر چکے ہیں۔ راقم الحروف کے ساتھ ایک ٹی۔وی انٹرویو میں جو یونیورسٹی گیسٹ ہاوس کے سامنے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں لیا گیا تھا ڈاکٹر تاراچرن نے فکر اقبالؔ میں تنگ نظری کے عنصر کی بات کہی تھی اور اس سلسلے میں کئی اشعار کا حوالہ بھی دیا تھا۔

''نگار'' لکھنو کے جنوری رفروری ۶۲ کے شمارے میں ڈاکٹر تاراچرن نے شاعر کا حوالہ دیئے بغیر کریم اللہ پالوی کے ایک مضمون سے یہ اشعار نقل کئے ہیں، جن سے اقبالؔ کی عرب اماکن کے ساتھ محبت وعقیدت اور ہندوستانی مقامات سے انکی مخاصمت کا اشارہ فراہم کیا گیا ہے۔

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اس نے پالا، اسی نے پوسا، اسی نے بخشی تجھے جوانی
تو دل کی آنکھوں سے دیکھ ان کو یہ کارنامے نہیں مخلصانہ
اگر یہ جنت ہے جنتی تو، اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تو
یہ قول ہے قول عاشقانہ، یہ راز ہے رازِ محرمانہ

ڈاکٹر تاراچرن صاحب کو شاید اقبالؔ کے حبِ وطن سے معمور وہ نغمے یاد

نہیں، جب عارضۂ وطن میں اقبالؔ پکار اٹھتے ہیں۔

سوادِ رومۃ الکُبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عظمت، وہی رفعت وہی شانِ دلآویزی

رام، کرشن جی، بھرتری ہری، سوامی تیرتھ، نانک اور دیگر عظیم ہندی رہنماؤں کا ذکرِ خیر کن الفاظ اور القاب کے ساتھ اقبالؔ نے کیا ہے اس کا تصوّر بھی بڑے غیر مسلم ہندی شعرا کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

اقبالؔ کی ذات پر چند معترضین نے ''بے عملی'' کا الزام بھی آئد کیا ہے۔ کسی حد تک بے عملی کے اشتہار میں ان کی اپنی طبیعت اور لا اُبالی مزاج کا عمل دخل بھی ہے۔ اور وہ جوانہوں نے ''گفتار کا غازی بن تو سکا، کردار کا غازی بن نہ سکا'' میں ندامت، انکساری اور مسلمانوں کی اکثریت کے کردار کی عکاسی کی ہے۔ اقبال کے ایک معترض عبدالمالک آروی نے ''موازنۂ حلاّج و اقبالؔ کے موضوع کے تحت چھپے اپنے ایک مضمون میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''مستیٔ کردار کے لحاظ سے اقبالؔ کو حلاّج سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں تک کہ دار و رسن تو بڑی چیز ہے اقبالؔ سیاسی دنیا میں جوہر، داس، اجمل اور نہرو بھی نہ بن سکے، ہم اقبالؔ کو عملی انسان نہیں مانتے''۔

سلیم احمد، عبداللہ یوسف علی، امین زبیری، اقبال سنگھ، کلیم الدین احمد اور علی عباس جلال پوری کے مقالات و آراء اقبالؔ کو عملی زندگی میں ناکام گردانتے ہوئے پے در پے الزامات، اشعار سے حوالہ جات اور مختلف مواقع پر دیئے گئے اقبالؔ کے بیانات سے استدلال کرتے ہوئے اقبالؔ دشمنی کا کھلا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ کہیں کہیں ان معترضین کے بیانات میں وزن بھی ہے، تاہم یہ بات صاف ہے کہ عملی اور علمی مساعی سے ہی اقبال بہشٹھ سال اور چند ماہ کی زندگی میں ایسا رفیع الشان کلام ترتیب دے سکے، جس پر سوچتے سوچتے، لکھتے اوتبیض وتسوید کے مرحلوں سے گذارتے ہوئے ان کا پورا وجود اعمال کا بڑا پیکر بن جاتا ہے۔ اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۸ء تک مشرق ومغرب کے کئی ملکوں کا سفر بھی کیا اور یہ وہ زمانہ تھا جب دور دراز سفر کے لیے موجودہ زمانے کی سفری سہولیات فراہم نہیں تھیں۔ ان کے پروفائیل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دوسروں کو سوز وگداز، درد وداغ، غیرت وحمیت اور راہِ عمل پر گامزن ہونے کی تلقین نہیں کرتے تھے، بلکہ عملی زندگی میں گھریلو مسائل سے لیکر مہمانوں کی خاطر تواضع، محفلوں اور سمیناروں کے لیے تیاری، سفر پر روانہ ہوتے وقت سفری اور دستاویزی مستعدی کا ثبوت دیتے تھے۔ اور بے عملی کے الزامات میں اگر تقویت فراہم ہوئی ہے، تو اس میں ان کے اپنے صاحبزادوں کی کارکردگی کا حصہ اہم ہے، جسٹس جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' میں تمام تفصیلات کے ساتھ اپنے والد کی

زندگی کا غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کیا ہے، لیکن کہیں کہیں ان کے قلم سے بھی ایسے اشارات ملتے ہیں، جن سے اقبالؔ کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے۔ جاوید اقبال صاحب سب سے معتبر راوی ہیں، لیکن اقبالؔ کی وفات کے وقت ان کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی اور ایک چھوٹے بچے کے ''معصوم تاثرات'' پر بڑے باپ کی عمارت کے عناصر و اجزا کا پتہ لگانا مناسب نہیں۔ ایک معروف ترین آدمی پر اگر بے عملی کی تہمت لگائی جائے، تو اس سے بڑھ کر اور کون سی بے عملی ہو سکتی ہے۔ بے عملی کا الزام اس شخص پر عائد ہو سکتا ہے جو جامد، گوشہ نشین، پناہ گزین اور جسمانی تگ و دو سے بالاتر ہو کر بیٹھے اور راہِ عمل سے فرار اختیار کرے۔ اقبالؔ کے تفکر، تدبر اور تفقہ میں ان کی طبعی عزلت پسندی یقیناً شامل تھی اور شخصیاتِ عالم اور نابغاتِ عصر کے سوانحی حالات میں بکثرت یہ چیزیں ملتی ہیں۔ ممتاز حسن کے اقبالؔ پر اعتراضات کے تناظر میں ادارۂ ''ہمایوں'' نے بہت عمدہ بات کہی تھی۔ ''ایسے پیغام کا پیش کرنا کسی بے عمل آدمی کا کام نہ تھا، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اقبال نے اپنے دل و دماغ کی بہترین طاقتوں کا پورا استعمال کیا ہے۔ یہی اقبالؔ کا بڑا کارنامہ اور یہی اس کا سب سے بڑا عمل ہے''۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ایمانی حمیت، یک جہتی اور صالح قدروں کا جو پیغام اقبالؔ نے دیا اس کی نظیر پیش کرنے سے گذشتہ پانچ سو سال کی ادھر کی تاریخ عاجز ہے۔ ہندو پاک کے معروف اسلامی اسکالر اور مُتکلم

ڈاکٹر اسرار احمد نے ''علامہ اقبالؔ اور ہم'' کے زیرِ عنوان تقاریر و خطبات پر مشتمل کتاب میں بہت عمدہ بات کہی ہے۔

''حضرت علامہ ہمیں وہ فکر دے گئے جو اس دور کے لاکھوں نہیں کروڑوں ''باعمل'' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے''۔

اقبالؔ پر ان کی زندگی میں اور انکی وفات کے بعد طرح طرح کے اعتراضات لگائے گئے، جن کا اجمال ذکر کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔

اپنی فارسی شاعری میں اقبالؔ نے اپنے بارے میں ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است'' جب کہا تو اس پر بھی کچھ ان کی برہمن زادگی پر فخر کرنے پر برہم ہو گئے۔

''کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق'' تو اس پر عنایت اللہ مشرقی نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا چنانچہ وہ مخالفتِ اقبالؔ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اقبال پر رنگ رلیاں منانے، سر کا خطاب لینے، شاہِ افغانستان امیر امان اللہ خان کی مدح میں پیام مشرق میں کچھ مدحیہ اشعار تحریر کرنے، غیر محبِ وطن ہونے اور رومانونیت و نرگسیت میں مبتلا ہونے کے الزامات و اتہامات بھی لگائے گئے۔ بہر کیف آنے والے ادوار میں جوں جوں بصیرت اقبالؔ کے انوار و اثرات عام ہوتے جائیں گے، اقبالؔ پر لگائے گئے اعتراضات کی قلعی کھل جائے گی اور چشمِ اقوام یہ نظارہ دیکھے گی کہ دانشوری اور دردمندی سے مُتصف

شاعر نے جو پیش گوئیاں کی تھیں، وہ مِن وعَن درست ثابت ہوگئیں۔اپنی مُتفرق، متنوع، متضاد اور متغیر شخصیت کی شاعرانہ عکس بندی اقبالؔ نے اپنے ہی الفاظ میں یوں کی ہے اور اسی پر اس اجمالی نوعیت کے مضمون کا اختتام بھی ہوگا۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپکی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی وادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمدانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے میرے ایک شنا سا سے یہ پوچھا

اقبالؔ کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اسکی طبیعت میں تشیُع بھی ذراسا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سُنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرأ کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 – 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے ۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے با آسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک:

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

IQBAL INSTITUTE
University of Kashmir, Hazratbal Srinagar